22

## تبدیلی کے لیے کثرتِ تعداد شرط نہیں ہے

اسکرین کوئی بھی ہو انسانی ذہن پر نفسیاتی اثر پیدا کرتی ہے

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد سے مکالمہ


fridayspecial.com.pk

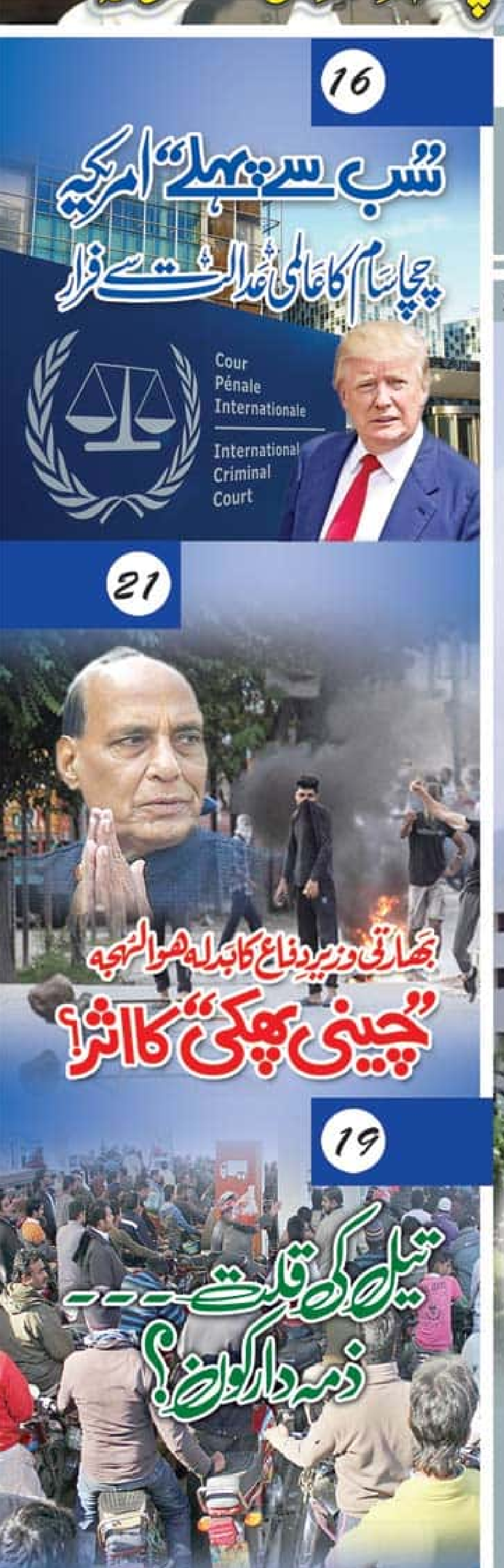


ہفت روزہ

# فرائیڈے اسپیشل

قیمت: 25 روپے

19-25 جون 2020ء شمارہ 25


# قائداعظم کے معاشی تصورات کی توہین

# اور آئی ایم ایف کے پھانسی گھاٹ پر لٹکا پاکستان

INTERNATIONAL MONETARY FUND



حق و سچ اور جرأت اظہار کے 50 تابندہ سال
جسارت سنڈے میگزین
کراچی تیرا کون؟
کراچی ایڈیشن
فرائیڈے اسپیشل
حیدرآباد ایڈیشن
Jasarat English
JASARAT NEWS
www.jasarat.com
جسارت
جسارت سنڈے میگزین
JASARAT NEWS
فرائیڈے اسپیشل
جسارت بلاگ






قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’پہلوان وہ شخص نہیں جو پچھاڑے، پہلوان وہ شخص ہے جو غصے کے وقت نفس پر قابو پالے‘‘۔

(بخاری، مسلم)

# توبہ

سید طاہر رسول قادری

’’وہی ہے جو اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں سے درگزر کرتا ہے، حالانکہ تم لوگوں کے سب افعال کا اسے علم ہے۔ وہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کی دعا قبول کرتا ہے۔ اور اپنے فضل سے ان کو اور زیادہ دیتا ہے۔ رہے انکار کرنے والے، تو ان کے لیے دردناک سزا ہے‘‘۔ (الشوریٰ:25،26)

یہ آیات اللہ تعالیٰ کی صفاتِ جلال و جمال کا آئینہ ہیں۔ یہ بتا رہی ہیں کہ ہر انسان اپنی موت کے آخری لمحے سے پہلے تک اگر اپنے رب کو پکارے، اس سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کو رحمٰن و رحیم پائے گا۔ معاف کردینے والا اغفار الذنوب پائے گا...... کیوں کہ وہ گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔

توبہ کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے کیے پر نادم ہو، جس برائی کا وہ مرتکب ہوا ہے یا ہوتا رہا ہے اُس سے باز آجائے، اور آئندہ اس کا ارتکاب نہ کرے۔ نیز یہ بھی سچی توبہ کا لازمی تقاضا ہے کہ جو برائی کسی شخص نے پہلے کی ہے، اس کی تلافی کرنے کی وہ اپنی حد تک پوری کوشش کرے، اور جہاں تلافی کی کوئی صورت ممکن نہ ہو، وہاں اللہ سے معافی مانگے اور زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرکے اس دھبے کو دھوتا رہے جو اس نے اپنے دامن پر لگالیا ہے......لیکن کوئی توبہ اُس وقت تک حقیقی توبہ نہیں ہے جب تک کہ وہ اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے نہ ہو۔ کسی دوسری وجہ یا غرض سے کسی برے فعل کو چھوڑ دینا سرے سے توبہ کی تعریف میں نہیں آتا۔

گناہ معاف کرنے اور توبہ قبول کرنے میں فرق ہے، اور وہ یہ کہ بسا اوقات توبہ کے بغیر بھی اللہ کے ہاں گناہوں کی معافی ہوتی رہتی ہے۔ مثلاً یہ کہ ایک شخص خطائیں بھی کرتا رہتا ہے اور نیکیاں بھی۔ اس طرح اُس کی نیکیاں اُس کی خطاؤں کی معافی کا ذریعہ بن جاتی ہیں خواہ اسے ان خطاؤں پر توبہ واستغفار کرنے کا موقع نہ ملا ہو، بلکہ وہ انہیں بھول چکا ہو۔

’’یہ ہے نیکی کرنے والوں کی جزا، تاکہ جو بدترین اعمال انہوں نے کیے تھے انہیں اللہ ان کے حساب سے ساقط کردے، اور جو بہترین اعمال وہ کرتے رہے ان کے لحاظ سے ان کو اجر عطا فرمائے‘‘ (الزمر: آیت:35)۔ اسی طرح سے سورۃ الفتح آیت 5 میں فرمایا گیا ہے: ’’تاکہ مومن مردوں اور عورتوں کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسی جنتوں میں داخل فرمائے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں اور ان کی برائیاں ان سے دور کردے‘‘۔ اسی طرح ایک شخص پر دنیا میں جتنی بھی تکلیفیں، مصیبتیں، بیماریاں اور طرح طرح کے رنج وغم پہنچانے والی آفات آتی ہیں، وہ سب اس کی خطاؤں کا بدل بن جاتی ہیں......لیکن توبہ کے بغیر معافی کی یہ رعایت اہلِ ایمان میں بھی صرف اُن کے لیے ہے جو سرکشی و بغاوت کے ہر جذبے سے خالی ہوں، اور جن سے گناہوں کا صدور محض بشری کمزوریوں کی وجہ سے ہوا ہو، اور جو ہمیشہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

☆ ---توبہ اللہ تعالیٰ کو بے حد پسند ہے

حضرت شعیب علیہ السلام اہلِ مدین کو نصیحت کرتے ہوئے ایک موقع پر کہتے ہیں: ’’دیکھو! اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ، بے شک میرا رب رحیم ہے۔ اور اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے‘‘۔ یعنی اللہ تعالیٰ سنگ دل اور بے رحم نہیں ہے۔ اس کو اپنی مخلوقات سے کوئی دشمنی نہیں ہے کہ خواہ مخواہ سزا دینے ہی کو اس کا جی چاہے اور اپنے بندوں کو مار مار کر ہی وہ خوش ہو۔ تم لوگ اپنی سرکشیوں میں جب حد سے گزر جاتے ہو اور کسی طرح فساد پھیلانے سے باز ہی نہیں آتے تب وہ تمہیں سزا دیتا ہے۔ ورنہ اس کا حال تو یہ ہے کہ تم خواہ کتنے ہی قصور کر چکے ہو، جب بھی اپنے افعال پر نادم ہو کر اس کی طرف پلٹو گے، اس کے دامنِ رحمت کو اپنے لیے وسیع پاؤ گے۔

اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مثالوں کے ذریعے اس طرح سمجھایا ہے کہ ’’اگر تم میں سے کسی شخص کا اونٹ ایک بے آب و گیاہ صحرا میں کھو گیا ہو، اور اس کے کھانے پینے کا سامان بھی اسی اونٹ پر ہو، اور وہ شخص اس کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مایوس ہو چکا ہو، یہاں تک کہ زندگی سے بے آس ہو کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا اور عین اس حالت میں یکایک وہ دیکھے کہ اس کا اونٹ سامنے کھڑا ہے تو اس وقت جیسی کچھ خوشی اس کو ہوگی اس سے بہت زیادہ خوشی اللہ کو اپنے بھٹکے ہوئے بندے کے پلٹ آنے سے ہوتی ہے‘‘۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کچھ جنگی قیدی گرفتار ہو کر آئے۔ ان میں ایک عورت بھی تھی جس کا شیر خوار بچہ چھوٹ گیا تھا اور وہ ماتا کی ماری ایسی بے چین تھی کہ جس بچے کو پالیتی اسے چھاتی سے چمٹا کر دودھ پلانے لگتی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حال دیکھ کر ہم لوگوں سے پوچھا ’’کیا تم لوگ توقع کرسکتے ہو کہ یہ ماں اپنے بچے کو خود اپنے ہاتھوں آگ میں پھینک دے گی؟‘‘ ہم نے عرض کیا ہرگز نہیں، خود پھینکنا تو درکنار، وہ آپ گرتا ہو تو یہ اپنی حد تک تو اسے بچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جواب سن کر فرمایا: ’’اللہ کا رحم اپنے بندوں پر اس سے بہت زیادہ ہے، جو یہ عورت اپنے بچے کے لیے رکھتی ہے‘‘۔

☆ ---توبہ کا موقع آثارِ موت سے پہلے تک ہے

قرآن اور حدیث دونوں اس معاملے میں ناطق ہیں کہ توبہ واستغفار کی جگہ یہ دنیا ہے، نہ کہ آخرت۔ دنیا میں بھی اس کا موقع صرف اُسی وقت تک ہے جب تک آثارِ موت طاری نہیں ہوجاتے۔ جس وقت آدمی کو یقین ہوجائے کہ اس کا آخری وقت آن پہنچا ہے، اُس وقت تک کی توبہ قبول ہے۔ موت کی سرحد میں داخل ہوتے ہی آدمی کی مہلتِ عمل ختم ہوجاتی ہے اور صرف جزا و سزا ہی کا استحقاق باقی رہ جاتا ہے۔

☆ ---عملی توبہ بھی کرنی چاہیے

گناہ کی تلافی کے لیے زبان اور قلب کی توبہ کے ساتھ ساتھ عملی توبہ بھی ہونی چاہیے۔ عملی توبہ کی ایک شکل یہ ہے کہ آدمی خدا کی راہ میں مال خیرات کرے۔ اس طرح وہ گندگی جو نفس میں پرورش پا رہی تھی اور جس کی بدولت آدمی سے گناہ کا صدور ہو رہا تھا، دور ہوجاتی ہے اور خیر و بھلائی کی طرف پلٹنے کی استعداد بڑھتی ہے۔ گناہ کرنے کے بعد اس کا اعتراف کرنا ایسا ہے جیسے ایک آدمی جو گڑھے میں گر گیا تھا، اپنے گرنے کو خود محسوس کرلے۔ پھر اس کا اپنے گناہ پر شرمسار ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اس گڑھے کو اپنے لیے نہایت ہی بری جگہ سمجھتا ہے اور اپنی اس حالت سے سخت تکلیف میں ہے۔ پھر اس کا صدقہ و خیرات اور دوسری نیکیوں سے اس کی تلافی کی سعی کرنا گویا گڑھے سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا ہے۔

(52 دروس قرآن، انقلابی کتاب---حصہ دوئم)

fridayspecial@hotmail.com




19 تا 25 جون 2020ء۔ جلد نمبر 26، شمارہ نمبر 25

## اس شمارے میں




ایڈیٹر
**یحییٰ بن زکریا صدیقی**

اسسٹنٹ ایڈیٹر
**اے، اے سید**
**منعم ظفر خان**

اسٹاف رائٹرز
شاہنواز فاروقی، سید عارف بہار
پروفیسر امان اللہ شادیزئی، سلمان عابد
محمود عالم صدیقی

وقائع نگار خصوصی
حامد ریاض ڈوگر لاہور (بیورو چیف)
میاں منیر احمد اسلام آباد (بیورو چیف)
عالمگیر آفریدی پشاور، احمد پلارا کوئٹہ
محمد شاہد شیخ حیدرآباد، حمیرا قریشی برائے خواتین

سب ایڈیٹر
**محمد شکیل**

بیرون ملک نمائندگان
معوذ اسعد امریکہ، مسعود ابدالی شمالی امریکہ
میاں محمد امجد فرانس، شہود ہاشمی سعودی عرب

انچارج شعبہ کمپیوٹر
**محمد سلمان کھوکھر**

لے آؤٹ کمپیوٹر گرافکس
ریاض احمد، سید عبدالغنی
برکت علی

ویب انچارج
عرفان احمد، شمس الرحمان

**انتظامیہ**

ڈائریکٹر مارکیٹنگ
**سید طاہر اکبر**

پروڈکشن و سرکولیشن
**محمد امین میمن**

پبلشر
**سید شاہد ہاشمی**

پرنٹر
**محمد علی** سٹی پریس کراچی

**شرح خریداری**

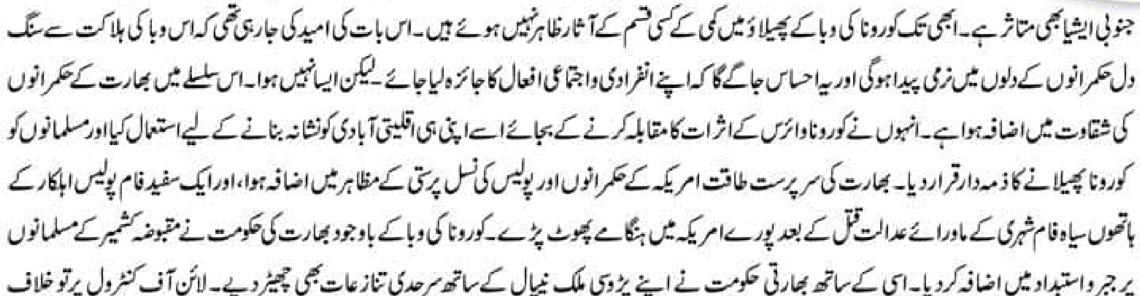
| | |
|---|---|
| پاکستان | Rs:950 |
| بنگلہ دیش، ایران، ترکی، شام، عراق، اردن، مصر | $:50 |
| شمالی و جنوبی امریکا و قریبی جزائر، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، فجی | $:80 |
| سعودی عرب، خلیجی ممالک، مشرق وسطیٰ، بھارت، جاپان | $:60 |
| برطانیہ، یورپ | 50 |




جمعیت الفلاح بلڈنگ اکبر روڈ صدر کراچی 74200
فون 3-021-32777060 فیکس 021-32777069

اسلام آباد: میلوڈی مارکیٹ نزد اسلام آباد ہوٹل فون 051-2828106، 051-2828159
لاہور: الشیخ چیمبرز، مزنگ روڈ لاہور 54000 فون 042-36370849

ویب گاہ fridayspecial.com.pk فیس بک facebook.com/FridaySpecialWeekly



اداریہ

# چین ۔ بھارت سرحدی جھڑپیں

جب عالمی سطح پر کورونا کی وبا پھیلنی شروع ہوئی تھی تو اُس وقت اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انتونیو گوتریس نے عالمی قیادت کو متنبہ کیا تھا کہ جنگوں اور علاقائی تنازعات کو ختم کیا جائے اور مشترکہ طور پر عالمی وبا کا مقابلہ کیا جائے۔ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کی یہ آواز غیر موثر ثابت ہوئی۔ عالمی وبا کے باوجود عالمی تنازعات اسی طرح جاری ہیں۔ گزشتہ سال 5 اگست کو بھارت نے مقبوضہ کشمیر کی دستوری اور آئینی حیثیت کو تبدیل کیا اور احتجاج کو کچلنے کے لیے ابھی تک لاک ڈاؤن جاری رکھا ہوا ہے۔ کورونا کی وبا سے پوری دنیا کے ساتھ جنوبی ایشیا بھی متاثر ہے۔ ابھی تک کورونا کی وبا کے پھیلاؤ میں کمی کے کسی قسم کے آثار ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔ اس بات کی امید کی جارہی تھی کہ اس وبا کی ہلاکت سے سنگ دل حکمرانوں کے دلوں میں نرمی پیدا ہوگی اور یہ احساس جاگے گا کہ اپنے انفرادی و اجتماعی افعال کا جائزہ لیا جائے ۔لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں بھارت کے حکمرانوں کی شقاوت میں اضافہ ہوا ہے۔ انہوں نے کورونا وائرس کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے بجائے اسے اپنی ہی اقلیتی آبادی کو نشانہ بنانے کے لیے استعمال کیا اور مسلمانوں کو کورونا پھیلانے کا ذمہ دار قرار دیا۔ بھارت کی سرپرست طاقت امریکہ کے حکمرانوں اور پولیس کی نسل پرستی کے مظاہر میں اضافہ ہوا، اور ایک سفید فام پولیس اہلکار کے ہاتھوں سیاہ فام شہری کے ماورائے عدالت قتل کے بعد پورے امریکہ میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ کورونا کی وبا کے باوجود بھارت کی حکومت نے مقبوضہ کشمیر کے مسلمانوں پر جبر و استبداد میں اضافہ کردیا۔ اسی کے ساتھ بھارتی حکومت نے اپنے پڑوسی ملک نیپال کے ساتھ سرحدی تنازعات بھی چھیڑ دیے۔ لائن آف کنٹرول پر تو خلاف ورزیاں جاری تھیں، اسی کے ساتھ لداخ میں چین اور بھارت کے درمیان سرحدی تنازعات بھی بڑھ گئے ہیں۔ چین اور بھارت کی سرحدی کشیدگی کے اثرات پاکستان اور مقبوضہ کشمیر پر بھی پڑیں گے۔ چین بھارت سرحدی کشیدگی کو ہم چین امریکہ سرد جنگ سے علیحدہ کرکے نہیں دیکھ سکتے۔ چین اور بھارت کے درمیان لداخ کے علاقے میں سرحدی تنازعات فوجی جھڑپوں میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ لداخ میں بھارت اور چین کی فوج کے درمیان 45 سال بعد مسلح تصادم ہوا ہے۔ بھارتی حکومت نے اپنے 20 فوجیوں کے مرنے کی تصدیق کی ہے اور 43 سے زائد چینی فوجیوں کی ہلاکت کا دعویٰ کیا ہے۔ چینی وزارتِ خارجہ کے ترجمان کے مطابق لائن آن ایکچول کنٹرول (ایل اے سی) کے علاقے وادی گلوان میں بھارتی فوجیوں نے پیر کو دو مرتبہ سرحدی خلاف ورزی کی، چینی اہلکاروں پر حملے کیے اور انہیں اشتعال دلایا۔ چینی ترجمان نے اس پر سخت احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ اتفاقِ رائے پر عمل کرتے ہوئے بھارت فرنٹ لائن پر تعینات فوجیوں کو سختی سے قواعد و ضوابط کا پابند کرے، وہ سرحد پار کرنے سمیت ایسے اقدامات نہ کریں جن سے معاملات پیچیدہ ہوں۔ چینی فوج کے ترجمان نے بھی بھارت کے ساتھ فوجی تصادم کی تصدیق کی ہے اور کہا ہے کہ ایل اے سی پر دونوں فوجوں کے درمیان شدید جسمانی جھڑپ ہوئی ہے۔ انہوں نے بھارتی فوج پر دراندازی کا الزام عائد کرتے ہوئے کہا کہ چینی فوج کو اشتعال دلایا گیا ہے۔ بھارتی فوج کی جانب سے پہلے 3 فوجیوں، بعد میں 17 مزید فوجیوں کی ہلاکت کی تصدیق کی گئی لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ فوجی کیسے زخمی اور ہلاک ہوئے ہیں۔ دونوں حکومتوں کی طرف سے فوجی تصادم کی تصدیق تو نہیں کی گئی ہے البتہ یہ واضح ہوگیا ہے کہ بھارتی حکومت چین کی حکومت اور فوج کو مسلسل اشتعال دلا رہی ہے، اور چین اپنی جغرافیائی حدود کے حوالے سے کسی مصالحت اور کمزوری کے لیے تیار نہیں ہے۔ بھارت نے بیک وقت اپنے تین پڑوسیوں پاکستان، نیپال اور چین کے ساتھ سرحدی تناؤ اور کشیدگی میں اضافہ کردیا ہے۔ چین اور بھارت کی کشیدگی اور نیپال کے ساتھ تناؤ کے واقعات ایک دوسرے سے منسلک ہیں اور اس کا اثر پاکستان کے اوپر بھی پڑے گا۔ پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت مسلسل خبردار کررہی ہے کہ بھارت جنگ چھیڑنے کے لیے کسی جھوٹے اقدام کا سہارا لے سکتا ہے۔ اسی تناظر میں انٹر سروسز انٹیلی جنس ہیڈکوارٹر میں افواجِ پاکستان کے سربراہوں کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس میں عسکری قیادت کو قومی سلامتی کے بارے میں تفصیلات سے آگاہ کیا گیا۔ یہ اجلاس غیر معمولی ہے۔ عام طور پر سیکورٹی امور کے حوالے سے عسکری قیادت چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کا فورم موجود ہے، لیکن یہ اجلاس آئی ایس آئی کے ہیڈکوارٹر میں منعقد ہوا ہے۔ اس سے قبل آئی ایس آئی ہیڈکوارٹر میں سیاسی قیادت کے ساتھ بھی دو بریفنگ ہوچکی ہیں۔ افغانستان کے امور بھی آخری مرحلے پر ہیں، بین الافغان مذاکرات کے حوالے سے دوحہ میں طالبان اور افغان حکومت کے مذاکرات کی تصدیق ہوچکی ہے۔ افغانستان میں امریکہ اور طالبان کے درمیان امن معاہدہ بھی بھارت کی ایک بہت بڑی ہزیمت ہے۔ اس تناظر میں بھارت نے چین کو مشتعل کیا ہے۔ کیا اس کی پشت پر امریکہ ہے جو عالمی سیاست میں اپنی ہزیمت اور پسپائی سے بچنے کے لیے بھارت کو ایک نئی جنگ پر اُکسا رہا ہے؟






## خارجہ پالیسی کے رہنما اصول

ہماری قومی خارجہ پالیسی کے رہنما اصول کیا ہونے چاہئیں؟ میری نظر میں یہ اصول درج ذیل ہیں:

☆نفسیاتی وروحانی، سماجی ومعاشی اور سیاسی حوالوں سے دنیا بھر کے مسلمان ایک اُمت ہونے کے ناتے ایک قوم ہیں۔

☆سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

☆بین الاقوامی تعلقات کے منظرنامے میں مسلمان ممالک ایک قدرتی بلاک ہیں۔

☆مسلمانوں کی جان، مال اور ناموس سے متعلق حقوق ناقابلِ تنسیخ ہیں۔

☆مسلمانوں کو کسی بھی بڑی طاقت کے مفادات کے سامنے سرنگوں نہیں ہونا چاہیے۔ اُن کا حق ہے کہ عالمی منظر پر خود ایک مؤثر قوت بن کر رہیں۔

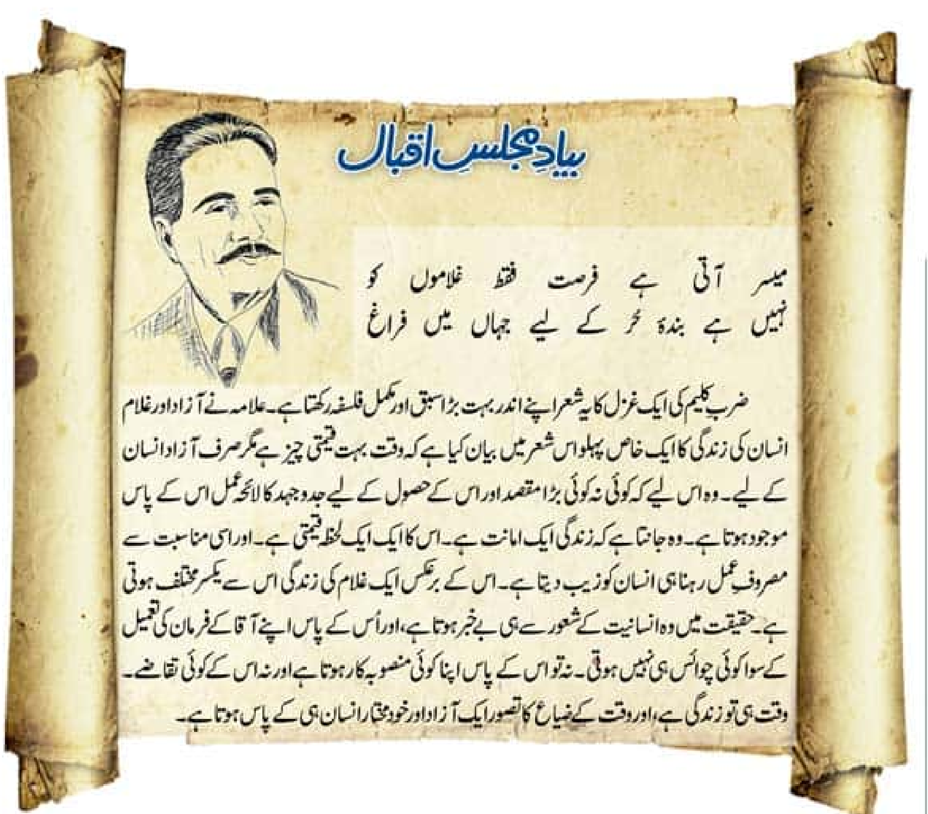
یہ رہنما اصول اُس وقت تک کوئی ٹھوس عملی شکل اختیار نہیں کر پائیں گے، جب تک کچھ الحاقی زمینی حقائق کی باقاعدہ تخلیق و تعمیر نہ ہو۔ ایک حرکی خارجہ پالیسی محض کسی درپیش صورتِ حال کا جواب ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ غیر موجود تصوراتی صورتِ حال میں بھی اپنا ایجنڈا آگے بڑھاتی رہتی ہے۔ ایسی خارجہ پالیسی ایک جان دار تخلیقی عمل ہے جس کا کسی لنگڑی لُولی پالیسی سے کوئی واسطہ نہیں بنتا۔

مسلم تعلقات کی پرورش اور اس میں عروج حاصل کرنے کے لیے پہلا اہم قدم یہ ہونا چاہیے کہ ہم انگریزی زبان کے مقابلے میں غلامانہ ذہنی رویّے سے جان چھڑائیں، جسے پھونک چڑھائی ہوئی بین الاقوامیت کے نام پر قطعی غلط طور پر بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اس معاملے میں تین اُمور پیشِ نظر رہیں:

اولاً، کوئی زبان محض ہُنر یا آلہ نہیں ہوا کرتا۔ زبان کے دوش پر سوار ثقافت اپنے اخلاقی عوامل اور نظریات کے ساتھ اُمڈتی چلی آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیروں کی زبان اپنانے والے اُن کی ثقافت بھی اوڑھنے بچھونے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ثانیاً، زبان لوگوں کو آپس میں جوڑے رکھنے کا ذریعہ ہے۔ انگریزی زبان کے ذریعے پاکستانی معاشرے میں جتنی انگریزیت آئے گی، اُسی قدر یہ قوم اپنے اسلامی ورثے سے دور ہٹتی جائے گی، اور یہ اپنے آپ کو انگریزی دان دنیا سے منسلک پائے گی۔ حالانکہ اُس دنیا سے نہ اس کا جغرافیائی قرب اور ہمسائیگی ہے، اور نہ اس کے ساتھ اس کا کوئی تاریخی رشتہ ہی ہے۔

ثالثاً، زبان اُس دشمن قوم کے خلاف پہلا دفاعی مورچہ ہوتا ہے جو اس سے مختلف زبان بولتی، سمجھتی ہے۔ دو دشمن قومیں اگر




میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حُر کے لیے جہاں میں فراغ

ضربِ کلیم کی ایک غزل کا یہ شعر اپنے اندر بہت بڑا سبق اور مکمل فلسفہ رکھتا ہے۔ علامہ نے آزاد اور غلام انسان کی زندگی کا ایک خاص پہلو اس شعر میں بیان کیا ہے کہ وقت بہت قیمتی چیز ہے مگر صرف آزاد انسان کے لیے۔ وہ اس لیے کہ کوئی نہ کوئی بڑا مقصد اور اس کے حصول کے لیے جدوجہد کا لائحہ عمل اس کے پاس موجود ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ زندگی ایک امانت ہے۔ اس کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ اور اسی مناسبت سے مصروفِ عمل رہنا ہی انسان کو زیب دیتا ہے۔ اس کے برعکس ایک غلام کی زندگی اس سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ حقیقت میں وہ انسانیت کے شعور سے ہی بے خبر ہوتا ہے، اور اُس کے پاس اپنے آقا کے فرمان کی تعمیل کے سوا کوئی چوائس ہی نہیں ہوتی۔ نہ تو اس کے پاس اپنا کوئی منصوبہ کار رہتا ہے اور نہ اس کے کوئی تقاضے۔ وقت ہی تو زندگی ہے، اور وقت کے ضیاع کا تصور ایک آزاد اور خودمختار انسان ہی کے پاس ہوتا ہے۔

ایک ہی زبان بولتی ہوں تو زمانۂ امن میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ ایک کے حصے بخرے ہوکر مخالف بڑے دھڑے میں شامل ہوتے جائیں۔ عالمِ عرب، عربی زبان کی بناء پر ایک ثقافتی حلقہ ہونے کی وجہ سے کامل ٹوٹ پھوٹ اور انتشار سے بچا رہا، کیونکہ عربی نے ہی انہیں غیروں کے نظریات سے محفوظ رکھا اور اُن کے آپس کے رابطے بحال رہے۔ باوجود اس کے کہ نوآبادیاتی طاقتوں کی تخلیق کردہ نئی سرحدیں انہیں کاٹنے اور پھاڑنے پر تُلی ہوئی تھیں۔

جہاں تک پاکستان کا معاملہ ہے کہ آج کی ہندی رنگ میں رنگی ہوئی اُردو جسے ہندی بنانے میں ہمارے زنادقہ کا خاص کردار ہے، اُس کے وجود کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ ہماری قومی بداعمالیوں کی وجہ سے کششِ ثقل اب ہندوستان منتقل ہونے لگی ہے۔ پاکستان اگر دیگر مسلمان ممالک کے لیے گونگا ہے تو ہندیت میں رچی بسی اُردو اسے ہندوستان کے لیے ناطق بنادیتی ہے۔ یہ ایسی صورتِ حال ہے جو پاکستان کو مغرب میں واقع اسلامی دنیا کے لیے مستقلاً اجنبی بناکر رکھ دے گی۔ مثلاً دیکھیے کہ لاکھوں پاکستانی بھارتی فلمیں دیکھتے ہیں جو اُن کی پسند و ناپسند پر اثرانداز ہورہی ہیں اور آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر اُن کے ہندوستان کے بارے میں حقیقی تحفظات میں کمی آرہی ہے، بلکہ اُسے برداشت کرنے کا بعض حلقوں میں رجحان بھی پیدا ہورہا ہے۔ جب کبھی ذرا زیادہ خوشحالی آئی اور دونوں ملکوں کی باہمی تلخی کم ہوئی اور نتیجتاً سیاحت کا سلسلہ عام ہوا تو ثقافتی بہاؤ ہندوستان کی طرف رہے گا۔ وجہ یہی ہندوانہ اُردو ہوگی، جسے ہمارا صحافتی طائفہ 1947ء سے مسلسل دودھ پلا رہا ہے۔ یہ بربادی کا راستہ ہے، لیکن تاحال ہمارے پالیسی سازوں کو اس کا احساس نہیں ہوپایا۔

اسی طرح یہ امر بالکل واضح ہے کہ ہمیں اپنے لوگوں کو انگریزیت میں ڈوبنے سے بچانا ہوگا، کیونکہ ہمارے قومی اور ملّی مفادات کا تحفظ نہ انگریزی اپنانے سے ہوگا، نہ ہندی زدہ اُردو سے۔ ایک ہمیں مغرب سے منسلک کرتی ہے، دوسری ہمیں جنوبی ایشیا میں محدود کرکے محض علاقے کی ایک دوسری قوم بناتی ہے۔ اُردو زبان کا جو سلسلہ عربی اور فارسی سے ٹوٹ چکا ہے، اُسے لازماً دوبارہ جوڑا جانا چاہیے، تاکہ اس کی مخصوص عربی ترکیب اور ڈھب بحال ہو۔ بلکہ پاکستان میں عربی اور فارسی ایک بار پھر انگریزی کی جگہ لیں۔ اگر ایک امریکی گریجویٹ کو مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ کم از کم ایک یورپی زبان ضرور سیکھے، تو ہم اپنے طلبہ سے کیوں نہ کہیں کہ وہ عربی یا فارسی زبان میں ضروری مہارت حاصل کریں؟ امریکی اگر اپنی خارجہ پالیسی میں ضرورت کے تحت کسی یورپی زبان پر زور دیتے ہیں تو اس کی وجہ یورپ سے اُن کا خونیں رشتہ ہے۔ اس تناظر میں ہم شرقِ اوسط اور مغربی ایشیا سے اپنے گہرے رشتوں اور تاریخی روابط سے کیسے صرفِ نظر کرسکتے ہیں؟ آج کیفیت یہ ہے کہ وسط ایشیائی ریاستوں کے حوالے سے امکانات کی بحث میں ساری لفاظی کے باوجود ہمارے عوام کی اکثریت ایرانیوں، ترکوں، وسط ایشیائی مسلمانوں اور عربوں سے مناسب میل جول رکھنے میں ناکام ہے۔ جب تک عوامی رابطوں کا سلسلہ وسیع نہیں ہوتا، تب تک مسلم دنیا سے ہمارے تعلقات محض سطحی بلکہ ڈانواڈول رہیں گے۔ ہم ہندوستانی ثقافت کے سامنے موم کی ناک بنے رہیں گے اور مسلمانوں کی علاقائی یکجہتی کے حوالے سے ہماری خارجہ پالیسی کے اقدامات جوش و جذبے سے یکسر عاری ثابت ہوں گے۔ یاد رہنا چاہیے کہ اسلامی تہذیب کے لیے مغربی تہذیب اگر بدترین ہے تو ہندی تہذیب اس کے ساتھ گھناؤنی بھی ہے۔

(”سیکولرزم: مباحث اور مغالطے“.....طارق جان)




**ایک** دفعہ کا ذکر ہے، دو کبوتر ایک دوسرے کے ہمسائے میں رہتے تھے۔ ایک کا نام تھا ''نامہ بر'' اور دوسرے کا ''ہرزہ''۔ ایک دن ہرزہ کہنے لگا: ''بھائی نامہ بر! آج میں بھی تمہارے ہمراہ چلوں گا''۔ نامہ بر بولا: ''نہ بھائی، میں تو سیدھا اپنے کام کے پیچھے ہوں گا لیکن تُو میری ہمراہی نہیں کر سکے گا۔ مجھے خدشہ ہے کہ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ تیرے سر مصیبت آئے اور میں بھی بدنام ہو جاؤں''۔

ہرزہ بولا: ''اگر سچ پوچھو تو میں سو تیز اور تنومند کبوتروں کو بھی اپنی شاگردی میں قبول نہ کروں اور تجھ جیسے چالیسوں کو سبق پڑھاؤں۔ میں نے تجھ سے کہیں زیادہ رنگا رنگ لوگوں کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ میں گھروں کی ہر چھت، ہر کونے کھدرے، ہر کبوتر خانے، ہر باغ اور ہر صحرا کی خبر رکھتا ہوں اور تیری نسبت کہیں زیادہ تیز ہوں۔ جب میں نے تیرے ہمراہ سفر کرنے کی خواہش ظاہر کی تو مطلب یہ تھا کہ میں کسی چیز سے نہیں ڈرتا''۔

نامہ بر بولا: ''یہ کسی چیز سے نہ ڈرنا ہی تو عیب ہے۔ ہاں زیادہ خوف ناکامی کا سبب بنتا ہے، لیکن خودسری اور بے باکی میں بھی کئی خطرات ہیں۔ جو لوگ مصیبت اور بدبختی کا شکار ہوتے ہیں، اپنی خودسری ہی کے باعث ہوتے ہیں۔ انہیں یہ زعم ہوتا ہے کہ دوسرے کے مقابلے میں زیادہ ہوش مند ہیں۔ پھر وہ اس زعم میں اتنا آگے نکل جاتے ہیں کہ بدبختی کا شکار ہو جاتے ہیں''۔

ہرزہ بولا: ''نہیں ایسا نہیں، تُو مطمئن رہ۔ میرے حواس قائم ہیں اور مجھے ہمیشہ یہ شعور رہتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں''۔

نامہ بر بولا: ''بہت خوب، لے تیار ہو جا۔ دانا پانی اپنے گھر ہی میں کھا پی لے اور جب میرے ساتھ چلے تو دورانِ راہ میں کسی بیگانے سے زیادہ گھل مل نہ جانا''۔ اس نے کہا: ''مجھے منظور ہے''۔ انہوں نے اپنے سفر کا آغاز کیا اور چھتوں، کبوتر خانوں اور کبوتروں کے پاس سے گزرتے اور باغوں اور کھیتوں پر سے ہوتے ہوئے وہ صحرا میں جا پہنچے اور اڑتے گئے، اڑتے گئے، حتیٰ کہ ایک جگہ جا پہنچے جہاں اونچی نیچی زمین پر چند سوکھے درخت کھڑے تھے۔ ہرزہ خوشی سے بولا: ''واہ وا، اب چند لمحے اس درخت پر بیٹھتے ہیں اور تھکن دور کرتے ہیں''۔

نامہ بر بولا: ''ہمیں دیر ہو جائے گی، لیکن خیر اگر بہت ہی تھک گیا ہے تو کوئی حرج نہیں''۔ وہ ایک درخت پر بیٹھ گئے اور ہر طرف نگاہ دوڑانے لگے۔ ہرزہ دور ایک طرف اشارہ کر کے کہنے لگا: ''وہ جگہ دیکھ رہا ہے؟ وہاں سبزہ بھی ہے، دانہ بھی ہے۔ چلو چلیں اور کھائیں''۔

نامہ بر بولا: ''میں دیکھ رہا ہوں، سبزہ بھی ہے، دانہ بھی ہے مگر جال بھی ہے''۔ ہرزہ بولا: ''تُو بڑا ڈرپوک ہے۔ تُو نے بس یہ سن رکھا ہے کہ شکاری سبزے کے درمیان دانہ بکھیر دیتے ہیں اور جال پھیلا دیتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر جگہ جال ہو''۔

نامہ بر بولا: ''نہیں میں ڈرپوک نہیں لیکن عقل رکھتا ہوں، اور سمجھتا ہوں کہ تپتے جلتے صحرا میں جہاں ہمیشہ گرم ہوا چلتی ہے، سبزہ نہیں اگتا اور دانہ پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب شکاری کی کارستانی ہے تاکہ لالچی پرندوں کو جال میں پھانس لے''۔

ہرزہ بولا: ''شاید اللہ نے یہاں اپنی قدرت کا جلوہ دکھایا ہو اور صحرا کے بیچ سبزے کا رنگ جمایا ہو''۔ نامہ بر بولا: ''تیری نگاہ صرف سبزے اور دانے پر ہے۔ وہ جو ٹیلے کے پاس مصنوعی ابریشم کی ٹوپی پہنے ایک شخص بیٹھا ہے، اسے بھی غور سے دیکھ۔ کیا تُو یہ نہیں سوچتا کہ آخر اس شخص کا یہاں کیا کام ہے؟''

ہرزہ بولا: ''ہو سکتا ہے یہ شخص سفر پر نکلا ہو اور ہماری ہی طرح تھک گیا ہو اور ستانے کی خاطر چند لمحوں کے لیے رک گیا ہو''۔

نامہ بر بولا: ''اچھا تو پھر وہ ٹوپی کو کیوں ہاتھوں سے تھامتا ہے اور سبزے اور بیابان میں کیوں اِدھر اُدھر اپنی نظر دوڑاتا ہے؟''

ہرزہ بولا: ''شاید وہ ٹوپی کو اس لیے ہاتھوں سے تھامتا ہے کہ اسے ہوا نہ اڑا لے جائے، اور بیابان میں اس لیے اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہے کہ اسے کوئی ایسا شخص دکھائی دے جائے جسے وہ اپنا رفیقِ سفر بنا لے''۔

نامہ بر بولا: ''بالفرض جو کچھ تُو کہتا ہے، ایسا ہی ہے، لیکن کیا تیری نگاہ ان باریک رسیوں پر نہیں پڑ رہی جو سبزے کے اوپر ہوا سے بل کھا رہی ہیں۔ یقیناً یہ جال کی رسیاں ہیں''۔

ہرزہ بولا: ''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہوا ان رسیوں کو اڑا کر یہاں لے آئی ہو اور یہ سبزے میں الجھ گئی ہو''۔ نامہ بر بولا: ''اچھا اگر یہ ساری باتیں درست ہوں تو بھی کیا تجھے نہیں سوجھتا کہ پانی اور آبادی سے دور اس صحرا میں یہ مٹھی بھر دانہ کہاں سے آ گیا؟''

ہرزہ بولا: ''ممکن ہے کہ پچھلے برس کے دانے یہی سبزہ بن گئے ہوں، یا کوئی اونٹ والا ادھر سے گزرا ہو اور اس کی بوری سے یہ دانے گر گئے ہوں۔ تُو دراصل وہم کا شکار ہے اور ہر چیز کے غلط معنی نکالتا ہے۔ پرندہ اگر اس قدر ڈرپوک ہو تو دانہ کبھی اس کے ہاتھ نہیں آتا''۔

نامہ بر بولا: ''میرے نزدیک شیطان تیرے دل میں وسوسے ڈال رہا ہے تاکہ تُو دانے کی خواہش میں وہاں جائے اور جال میں قید ہو جائے۔ میرے عزیز، میری جان! سمجھ دار کبوتر کو آخر اتنا قیاس تو کر ہی لینا چاہیے کہ صحرا میں یہ ساری چیزیں بلاوجہ تو اکٹھی نہیں ہو گئیں۔ وہ ٹوپی والا شخص، وہ سبزہ کہ اچانک اس صحرا میں پیدا ہو گیا، وہ رسیاں، وہ مٹھی بھر دانے جو اس کے نیچے بکھرے ہیں...... ان سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرندوں کو شکار کرنے کے لیے جال بچھایا گیا ہے۔ تُو کیوں اس قدر بے شرم اور ڈھیٹ ہو گیا ہے کہ شکم پروری کی جھونجھ میں خود کو قید میں ڈالے دے رہا ہے''۔

ہرزہ قدرے خوف زدہ ہوا اور اس نے دل میں کہا ''ہاں ممکن تو ہے کہ جال بچھا ہو، لیکن کتنے ہی پرندے ہیں کہ جال کے نیچے سے دانہ چن کو کھاتے ہیں، اڑ جاتے ہیں اور جال میں گرفتار نہیں ہونے پاتے۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ جال فرسودہ اور بوسیدہ ہوتے ہیں اور پرندہ انہیں ٹکڑے کر دیتا ہے۔ اکثر صیاد ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جب ان سے عرض معروض کرتے ہیں تو ان کا دل نرم پڑ جاتا ہے اور وہ پرندے کو آزاد کر دیتے ہیں، اور اکثر ناگہانی اتفاقات بھی تو ہو جاتے ہیں کہ صیاد کے سر مصیبت آن پڑتی ہے، مثلاً ہو سکتا ہے کہ شکاری اچانک بے ہوش ہو کر گر جائے اور میں فرار کر جاؤں''۔

ہرزہ انہی سوچوں میں گم تھا۔ پھر بولا: ''تُو جانتا ہے قصہ کیا ہے؟ میں بھوکا ہوں اور چاہتا ہوں کہ جاؤں اور وہ دانہ کھا لوں۔ کچھ بھی تو معلوم نہیں کہ کوئی خطرہ ہے بھی! میں جاتا ہوں کہ دیکھوں کیا صورت ہے۔ اگر خطرہ ہوا تو لوٹ آؤں گا۔ جب تک میں نہیں لوٹتا تُو یہیں میرا انتظار کر''۔

نامہ بر بولا: ''میں تیرے لالچ سے ڈرتا ہوں۔ تُو خود کو قید میں ڈال رہا ہے۔ آ، میری بات سن اور اس امتحان سے باز آ''۔

ہرزہ بولا: ''تجھے کیا کام ہے مجھ سے! تُو میرا ضامن نہیں۔ مجھے کسی وکیل یا سرپرست کی ضرورت نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ اگر میں لوٹ آیا تو ہم اکٹھے چلیں گے۔ اگر میں گرفتار ہو گیا تو تُو اپنے کام کی پیروی کرنا۔ میں جانتا ہوں کہ میری نجات کی صورت کیا ہے''۔

نامہ بر بولا: ''مجھے نہایت افسوس ہے کہ تُو نے میری نصیحت پر کان نہ دھرا''۔

ہرزہ بولا: ''تُو بے کار میں افسوس کر رہا ہے۔ تُو اپنے آپ کو نصیحت کر کہ اس قدر بے دست و پا اور نالائق ہے کہ دوسروں کے لیے خط لے جا رہا ہے اور خود اس دانے سے جو قدرت نے صحرا میں لا ڈالا ہے، فائدہ نہیں اٹھاتا''۔

ہرزہ یہ کہہ کر دانے کی طلب میں اڑا۔ جب وہاں پہنچا تو اس

(باقی صفحہ 41 پر)

# شیخ سعدی شیرازی

ابوسعدی



شیخ مشرف الدین مصلح بن عبداللہ فارسی کے اکابر شعرا اور نثر نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ مصلح الدین لقب اور سعدی تخلص تھا۔ تقریباً 604ھ میں شیراز میں پیدا ہوئے۔ اوائل عمری میں والد کا انتقال ہوگیا۔ 15 برس کی عمر میں حصولِ علم کی خاطر عازم بغداد ہوئے۔ مدرسہ نظامیہ بغداد سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد شام، دمشق، حجاز اور مکہ شریف کا سفر کیا۔ صلیبی جنگوں میں عیسائیوں نے ''بیابانِ قدس'' سے گرفتار کیا اور بیگار میں خندق کھودنے کا کام لینے لگے، یہاں تک کہ امیر حلب نے آپ کو پہچان کر عیسائیوں سے خرید لیا اور اپنی بیٹی آپ کے حبالہ عقد میں دے دی، جس کی زبان درازی اور تند خوئی سے سعدی پریشان رہے۔ ان کے والد نے ان کی تربیت اس طرح سے کی جیسے کوئی عارف اور سالک اپنے مرید کی کرتا ہے۔ مدرسہ نظامیہ میں ابن جوزی جیسے محدث کے پاس پڑھا، مگر شاید ان کا گہرا اثر قبول نہیں کیا۔ تصوف وسلوک کی تعلیم انہوں نے شیخ شہاب الدین سہروردی سے حاصل کی۔ چالیس سال تک سیر و سیاحت اور اہلِ علم و فضل کی زیارت کے بعد شیراز واپس آ گئے۔ اس زمانے میں اتابکانِ فارس میں سے ابوبکر بن سعد بن ابوبکر زنگی حکمران تھا، جس سے انہوں نے وابستگی اختیار کی۔ 655ھ میں دس ابواب پر مشتمل پند و نصائح کی حامل کتاب "بوستان" تصنیف کی۔ 656ھ میں ایک اور عالی قدر تصنیف "گلستان" کے عنوان سے رقم کی، جو ایک مقدمہ، آٹھ ابواب اور خاتمہ پر محیط ہے۔ یہ فارسی میں نثرِ مسجع کا عمدہ ترین نمونہ ہے۔ علاوہ ازیں ایک شاعر کی حیثیت سے تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ غزل میں بالخصوص انفرادیت رکھتے ہیں۔ ان کے بعد شعرا اور نثار کی ایک بڑی تعداد نے ان کی پیروی کی کوشش کی اور وہ ان کے کلام اور سبک کو اپنے لیے ایک نمونہ قرار دیتے ہیں۔ سعدی عالمگیر شہرت کے حامل ہیں۔ ان کی تصانیف کے دنیا کی بیشتر زبانوں میں تراجم ہوئے۔ اخلاق و حکمت اور عرفان و تصوف کے اعتبار سے ان کی شخصیت اور تصانیف لاجواب ہیں۔ اخلاقی اور حکیمانہ شاعری اور اسلوب نے انہیں ممتاز کیا اور ہر عہد میں وہ قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے رہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے ان کی شخصیت اور تصانیف پر ایک مستقل تصنیف "حیاتِ سعدی" کے عنوان سے اردو زبان میں لکھی ہے۔ 691ھ میں وفات پائی اور اپنے شہر میں ایک پہاڑ کے دامن میں مدفون ہوئے۔

(پروفیسر عبدالجبار شاکر)

## غلام کا بلند مرتبہ

کسی دنیادار نے حضرت لقمان سے پوچھا:

''آپ فلاں خاندان کے غلام رہے ہیں تو پھر یہ مرتبہ، یہ عزت اور ناموری، وہ کون سے عوامل تھے جن کی وجہ سے آپ کو یہ بلند مرتبہ ملا؟''

آپ نے فرمایا: ''راست گوئی، امانت میں خیانت نہ کرنا، ایسی گفتگو اور ایسے عمل سے گریز کرنا جس سے مجھے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا، جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر حرام فرما دیا ہے ان سے قطعی گریز کرنا، لغو باتوں سے پرہیز کرنا، حلال رزق پیٹ میں ڈالنا۔۔۔ جو ان سادہ باتوں پر مجھ سے زیادہ عمل کرے گا وہ مجھ سے زیادہ عزت پائے گا، اور جو آدمی میرے جتنا عمل کرے گا وہ مجھ جیسا ہوگا''۔

درسِ حیات: احکاماتِ خداوندی پر عمل کرنے سے دنیا و آخرت میں بلند مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔

("حکایاتِ رومی"۔۔۔ مولانا جلال الدین رومیؒ)

## ناولٹ (Novelette)

یہ نثری صنفِ ادب ہے۔ ناولٹ افسانے اور ناول کی درمیانی کڑی ہے۔ زندگی کے حقیقی منظر کو بے اختیار اور بے لاگ مگر تخلیقی بیان دینا ''ناولٹ'' کی ذمہ داری ہے۔ ناولٹ زندگی کے متعلقات کے بارے میں ناول کی نسبت اختصار و ایما سے کام لیتا ہے۔ اردو میں ناولٹ نگاری کے تجربے ہوئے لیکن حقیقت میں انگریزی مصنفین نے اسے کمال بخشا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے تھامس اڈل کے ناولٹ پر بحث کے دوران اشکالی وضاحت کے تجزیے کے بعد لکھا ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اس ناولٹ کو ایک مختصر ناول کا ہی نام دے سکتے ہیں۔

## آدمیوں کی چار قسمیں

حضرت علیؓ (661ء) کا ارشاد ہے کہ آدمیوں کی چار قسمیں ہیں: کریم، سخی، بخیل اور لئیم۔

1: کریم وہ ہے جو خود نہ کھائے اور دوسرے کو کھلائے۔
2: سخی وہ ہے جو خود بھی کھائے اور دوسروں کو بھی کھلائے۔
3: بخیل وہ ہے جو خود تو کھائے لیکن دوسروں کو نہ کھلائے۔
4: اور لئیم وہ ہے جو نہ خود کھائے اور نہ دوسروں کو کھلائے۔

## محفل میں کہاں بیٹھنا بہتر ہے؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''جب تجھے دعوت دی جائے تو یاد رکھ سب سے اونچی جگہ نہ جا بیٹھنا، تاکہ اگر میزبان کا تجھ سے بڑا دوست آ جائے تو میزبان تجھ سے یہ نہ کہے کہ ''اٹھ اور نیچے جا بیٹھ''۔ ایسا تیرے لیے باعثِ شرمندگی ہوگا۔ اس لیے سب سے حقیر جگہ بیٹھ، تاکہ جس نے تجھے دعوت دی ہے وہ آ کر کہے: ''اٹھ دوست! اور یہاں اوپر آ کر بیٹھ''۔ اس طرح تیری بڑی عزت ہوگی۔ یاد رکھ، جو بھی خود کو بلند کرتا ہے پست کیا جائے گا، اور جو خود کو پست کرتا ہے بلند کیا جائے گا''۔

# تین پرتوں والا فیبرک ماسک‘ کورونا وائرس کو روک سکتا ہے

عالمی ادارہ صحت کا کہنا ہے کہ کپڑے (فیبرک) کی تین پرتوں والا ماسک استعمال کیا جائے تو اس سے کورونا وائرس کا پھیلاؤ روکنے میں موثر مدد مل سکتی ہے۔ یہ ماسک گھر میں بنایا ہوا بھی ہوسکتا ہے اور کسی گارمنٹ فیکٹری میں تیار شدہ بھی۔ البتہ اس میں کپڑے کی تین پرتیں (لیئرز) بالترتیب کچھ ایسی ہونی چاہئیں: سب سے اندرونی پرت جو کسی جاذب کپڑے سے بنی ہو، درمیانی پرت جو ایسے کپڑے پر مشتمل ہو جو فلٹر کا کام کرے، جبکہ سب سے بیرونی پرت کسی غیر جاذب کپڑے مثلاً پولیسٹر سے تیار کی گئی ہو۔ واضح رہے کہ عالمی ادارہ صحت کی جاری کردہ رہنما ہدایات کے مطابق ماسک کا استعمال خصوصاً ایسی جگہوں پر ضروری ہے جہاں سماجی فاصلہ رکھنا بہت مشکل یا ناممکن ہو۔ اپنی ایک حالیہ آن لائن دستاویز میں عالمی ادارہ صحت نے زور دیا ہے کہ فیبرک ماسک کو نہ صرف ’’صحیح طریقے‘‘ سے پہنا جائے بلکہ پابندی سے اس کی دھلائی صفائی بھی کرتے رہنا چاہیے۔ اسی دستاویز میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ کورونا وائرس سے بچنے کے لیے سرجیکل ماسک صرف وہی افراد استعمال کریں جو کسی اسپتال یا طبی مرکز میں کام کررہے ہوں اور ڈیوٹی پر موجود ہوں۔ صحت مند لوگوں کے لیے تین پرتوں والا کپڑے کا ماسک ہی کافی ہے جس کی تفصیلات ابھی بیان کی گئی ہیں۔ کورونا وائرس سے بیمار ہوجانے والوں کو عالمی ادارہ صحت نے مشورہ دیا ہے کہ وہ خود کو باقی تمام گھر والوں سے الگ تھلگ کرلیں اور کسی کمرے میں محدود ہوجائیں، ڈاکٹر سے لازماً مشورہ لیں، ضرورت پڑنے پر اپنے اہلِ خانہ سے مدد لیں، اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ملنے جلنے والوں کو بھی قرنطینہ کروائیں۔

تاہم اگر کورونا وائرس سے بیمار ہوجانے والے کسی شخص کے لیے باہر جانا بے حد ضروری ہوجائے تو اس پر لازم ہے کہ وہ سرجیکل ماسک پہنے بغیر گھر سے باہر نہ نکلے۔ عالمی ادارہ صحت نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ ماسک کے استعمال کو سماجی فاصلے، ہاتھوں کی صفائی اور صحت کا تحفظ کرنے کے لیے دوسرے عملی اقدامات کا متبادل ہرگز نہ سمجھا جائے، البتہ کورونا کا پھیلاؤ روکنے میں ماسک سے مدد ضرور ملتی ہے۔



## واٹس ایپ کا اپنا پیمنٹس فیچر

واٹس ایپ نے آخرکار اپنے پیمنٹس فیچر کو متعارف کرانا شروع کردیا ہے، جس پر طویل عرصے سے کام کیا جارہا تھا۔ واٹس ایپ کی جانب سے یہ فیچر سب سے پہلے برازیل میں متعارف کرایا گیا ہے جہاں صارفین رقوم کی ترسیل اور اشیاء کی خریداری پر ادائیگی ایپ سے نکلے بغیر کرسکیں گے۔ ادائیگیوں کا طریقہ کار فیس بک پے کے ذریعے طے ہوگا، یعنی صارف فیس بک مارکیٹ پلیس میں اشیاء کی خریداری کے لیے محفوظ تفصیلات کو استعمال کرسکیں گے اور دوستوں کو بھی میسنجر پر رقوم بھیج سکیں گے۔ ابتدا میں یہ فیچر برازیل کے تین بینکوں کی جانب سے جاری کارڈز سے کام کرسکے گا اور ہر ٹرانزیکشن 6 ہندسوں کے پن یا فنگر پرنٹ اسکین سے ہوگی۔ عام صارفین کو رقوم کی ترسیل یا خریداری پر کسی قسم کی فیس ادا نہیں کرنا ہوگی۔

## وی پی این 30 جون کے بعد رجسٹریشن کے بغیر بند کرنے کا فیصلہ

پاکستان ٹیلی کمیونی کیشن اتھارٹی (پی ٹی اے) نے کہا ہے کہ ملک میں انٹرنیٹ پر ہر طرح کے مواد تک رسائی کے لیے ورچوئل پرائیویٹ نیٹ ورکس (وی پی این) سافٹ ویئر کا استعمال کرنے والے صارفین 30 جون تک رجسٹریشن کروالیں، دوسری صورت میں وہ مذکورہ سہولت کو استعمال نہیں کرسکیں گے۔ پی ٹی اے کی جانب سے جاری اشتہارات اور نوٹیفکیشن میں انٹرنیٹ صارفین کو تجویز دی گئی ہے کہ وہ اپنے انٹرنیٹ سروس پرووائیڈر سے 30 جون تک وی پی این کی رجسٹریشن کروالیں۔ پی ٹی اے کے مطابق 30 جون تک تمام صارفین مفت میں انٹرنیٹ سروس پرووائیڈرز سے وی پی این کی رجسٹریشن کرواسکتے ہیں۔

صارف کو وی پی این کی رجسٹریشن کے لیے اپنے انٹرنیٹ پروٹوکول (آئی پی) ایڈریس سمیت وی پی این سافٹ ویئر کی تفصیلات اور اسے استعمال کرنے کے مقاصد یا اپنے کاروبار کی تفصیل بھی فراہم کرنی پڑے گی۔ وی پی این کے ذریعے نہ صرف عام صارفین متنازع اور ملک میں پابندی کے شکار انٹرنیٹ مواد تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں بلکہ ایسے سافٹ ویئرز کو کاروباری ادارے اور خصوصی طور پر بینک بھی استعمال کرتے ہیں۔ ایسے سافٹ ویئرز کو استعمال کرتے ہوئے موبائل و انٹرنیٹ آپریٹرز غیر قانونی کاروبار بھی کرتے ہیں، جب کہ کچھ کاروباری ادارے ان سافٹ ویئرز کو استعمال کرتے ہوئے ٹیکس سے بچنے کے لیے غیر قانونی طور پر پیسوں کا لین دین بھی کرتے ہیں۔ پی ٹی اے کی جانب سے وی پی این کی رجسٹریشن کی تاریخ کا اعلان ایک ایسے وقت میں سامنے آیا ہے جب حال ہی میں کئی انٹرنیٹ صارفین نے وی پی این سافٹ ویئرز کے کام نہ کرنے کی شکایات کی تھیں۔ صارفین نے شکایات کی تھیں کہ انہیں وی پی این تک آسانی سے رسائی دینے والے ٹوری براؤزر کے ذریعے بھی وی پی این تک رسائی میں مشکلات پیش آرہی ہیں۔ تاہم دوسری جانب پی ٹی اے نے وضاحت کی ہے کہ انہوں نے تاحال وی پی این یا ٹوری براؤزر کے حوالے سے کوئی ایکشن نہیں لیا اور اس ضمن میں 30 جون کے بعد کارروائی کا آغاز کیا جائے گا۔



شاہنواز فاروقی

گفتگو




# قائداعظم کے معاشی تصورات کی توہین اور آئی ایم ایف کے پھانسی گھاٹ پر لٹکا پاکستان

## تمام سیاسی اور فوجی حکمران "قائداعظم کے معاشی تصورات کی توہین مجرم" اور پاکستان کے غدار ہیں

قائداعظم نے بی بی سی کے نمائندے ڈونلڈ ایڈورڈ کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا:

''اقتصادی اعتبار سے پاکستان ایک طاقت ور ملک ہوگا''۔

قائداعظم نے کراچی میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''میں آپ کے تحقیقی ادارے کے اس کام کا دلچسپی سے جائزہ لیتا رہوں گا جو وہ بینکاری کے طریقوں کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کے لیے انجام دے گا۔ مغرب نے انسانیت کے لیے ناقابلِ حل مسائل پیدا کردیے ہیں۔ ان مسائل کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ اب کوئی معجزہ ہی مغرب کو تباہی سے بچا سکتا ہے۔ مغرب انسانوں کے درمیان مساوات پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے۔ مغرب کے معاشی نظریات اور عمل انسانوں کو خوش اور مطمئن رکھنے کے سلسلے میں ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ ہمیں اپنی تقدیر خود بنانی ہوگی اور دنیا کے سامنے اسلام کے سماجی انصاف اور مساوات کے تصورات پیش کرنے ہوں گے۔'' (یکم جولائی 1948ء)

قائداعظم نے ایک موقع پر فرمایا:

''ہمارا مقصود لوگوں کو امیر سے امیر تر بنانا نہیں ہے، نہ ہی ہمارا مقصد سرمایہ دارانہ ہے۔ ہمارا مقصد اسلامی ہے''۔

قائداعظم نے ایک بار کہا: ''میں اب ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ خدا نے مجھے بہت نوازا..... مگر میں اپنا خون کیوں پانی بنانے پر تلا ہوا ہوں! اس کی صرف ایک وجہ ہے، ہمارے غریب لوگ''۔

قائداعظم نے ایک بار ارشاد فرمایا: ''ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم لوگوں کی غربت کا مسئلہ حل کریں''۔

قائداعظم نے مسلم لیگ کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''مجھے اہلِ دیہات کی غربت اور مفلوک الحالی دیکھ کر بہت رنج ہوتا ہے۔ میں نے سفر کے دوران میں جب ریلوے اسٹیشنوں پر پنجاب کے دیہاتی مسلمانوں کے گروہ دیکھے تو مجھے ان کے افلاس سے سخت دکھ ہوا۔ پاکستان کی حکومت کا سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ ان لوگوں کا معیارِ زندگی بلند کرے، اور زندگی بلکہ بہتر زندگی سے شادکام ہونے کے سامان بہم پہنچائے''۔ (اجلاس مسلم لیگ لائل پور۔ 18 نومبر 1942ء)

قائداعظم نے مسلم لیگ کے ایک اور اجلاس میں فرمایا:

''میں ضروری سمجھتا ہوں کہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کو متنبہ کردوں۔ اس طبقے کی خوشحالی کی قیمت عوام نے ادا کی ہے۔ اس کا سہرا جس نظام کے سر ہے، وہ انتہائی ظالمانہ اور شرانگیز ہے، اور اس نے اپنے پروردہ عناصر کو اس حد تک خودغرض بنادیا ہے کہ انہیں دلیل سے قائل نہیں کیا جاسکتا۔ اپنی مقصد براری کے لیے عوام کا استحصال کرنے کی خو ئے بد ان کے خون میں رچ گئی ہے۔ وہ اسلامی احکام کو بھول چکے ہیں۔ حرص و ہوس نے سرمایہ داروں کو اتنا اندھا کردیا ہے کہ وہ جلبِ منفعت کی خاطر دشمن کا آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ آج ہم اقتدار کی گدی پر متمکن نہیں۔ آپ شہر سے باہر کسی جانب چلے جائیے، میں نے دیہات جاکر خود دیکھا ہے کہ ہمارے عوام میں لاکھوں افراد ایسے ہیں جنہیں دن میں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ کیا آپ اسے تہذیب اور ترقی کہیں گے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ کیا آپ نے سوچا کہ کروڑوں لوگوں کا استحصال کیا گیا ہے اور اب ان کے لیے دن میں ایک بار کھانا حاصل کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ اگر پاکستان کا حصول اس صورتِ حال میں تبدیلی نہیں لاسکتا تو پھر

> دنیا کی تاریخ گواہ ہے جب قوم نے مادی عروج حاصل کیا ہے تعلیم اور صحت کے شعبوں کو مستحکم کر کے حاصل کیا ہے۔ چین اس کی حالیہ اور سب سے بڑی مثال ہے۔ چین نے معیشت کے دائرے میں جو ''معجزہ'' کر دکھایا ہے اُس کی بنیاد تعلیم میں چین کی غیر معمولی پیش رفت ہے۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ چین چالیس سال میں دنیا کی دوسری بڑی معیشت بن کر ابھر آیا ہے

اسے حاصل نہ کرنا ہی بہتر سمجھتا ہوں۔ اگر وہ [سرمایہ دار اور زمیندار] عقل مند ہیں تو نئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیں گے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو پھر خدا ان کے حال پر رحم کرے۔ ہم ان کی کوئی مدد نہ کریں گے۔'' (اجلاس مسلم لیگ، دہلی، 24 مارچ 1943ء)

قائداعظم نے ایک مل کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''اگر پاکستان کو دنیا کے اسٹیج پر اپنے حصے کا کردار ادا کرنا ہے جو اس کے رقبے، آبادی اور وسائل کے شایانِ شان ہو تو اسے زراعت کے ساتھ ساتھ صنعت کو بھی ترقی دینی ہوگی، اور اپنی معیشت کی بنیاد صنعت پر رکھنی ہوگی۔ اپنی مملکت کو صنعتی بنانے سے ضروریاتِ زندگی کے لیے دوسرے ملکوں کی محتاجی کم ہو جائے گی، لوگوں کو روزگار کے لیے زیادہ مواقع فراہم ہوں گے اور مملکت کے وسائل میں بھی اضافہ ہوگا''۔ (ولیکا ملز کی تقریب سے خطاب، 25 ستمبر 1947ء)

قائداعظم کے ان معاشی تصورات کو دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ قائداعظم معاشی طور پر پاکستان کو مندرجہ ذیل خوبیوں سے آراستہ دیکھنا چاہتے تھے:

(1) پاکستان معاشی اعتبار سے طاقت ور ہو۔

(2) پاکستان کا معاشی اور مالیاتی نظام اسلام پر مبنی ہو۔

(3) پاکستان کا معاشی نظام سرمایہ داری کی نحوست سے پاک ہو۔

(4) پاکستان کے معاشی نظام سے امیر امیر تر، اور غریب غریب تر نہ بنے۔

(5) پاکستان کا معاشی نظام استحصال سے پاک ہو۔

(6) پاکستان غربت کے شکنجے سے آزاد ہو۔

(7) پاکستان کا معاشی نظام بیرونی طاقتوں کا اسیر نہ ہو۔

(8) ہم معاشی نظام کی تشکیل کے لیے صرف اسلام کی طرف دیکھیں، مغرب کی طرف نہیں۔

(9) پاکستان کے حکمرانوں کو غریب طبقات کی بہت فکر ہونی چاہیے، کیونکہ قائداعظم کے بقول وہ غریبوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے اپنا خون پانی بنا رہے تھے۔

(10) پاکستان کے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا فرض ہے کہ وہ خود کو پاکستان کے مثالیوں یا Ideals کے مطابق ڈھالیں، ورنہ ان کی خیر نہیں۔

قائداعظم پاکستان کو معاشی طور پر مضبوط اور توانا دیکھنا چاہتے تھے، مگر پاکستان کی فوجی اور سول اجلافیہ پاکستان کو معاشی طور پر طاقت ور تو کیا بناتی، اس نے پاکستان کو معاشی اعتبار سے دیوالیہ کر دیا ہے۔ قائداعظم کے وژن کے مطابق پاکستان کو آزادی کے 72 سال بعد دنیا کی دس بڑی معیشتوں میں سے ایک ہونا چاہیے تھا، مگر پاکستان دنیا کی 40 بڑی معیشتوں میں بھی شامل نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارا شمار دنیا کی کمزور ترین معیشتوں میں ہوتا ہے۔ عمران خان کئی بار کہہ چکے ہیں کہ ہم دیوالیہ ہونے سے بال بال بچے ہیں۔

قائداعظم پاکستان کے پورے معاشی اور مالیاتی نظام کو اسلام کی بنیاد پر استوار دیکھنا چاہتے تھے، مگر آزادی کے 72 سال بعد بھی ہماری معیشت سود پر کھڑی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام ہمارے گلے کے پھندے کے بجائے ہمارے گلے کا ہار بنا ہوا ہے۔ قائداعظم 75 سال پہلے کہہ رہے تھے کہ سرمایہ دارانہ نظام تباہی کی طرف گامزن ہے، مگر ہمارے حکمران طبقے کو اب بھی سرمایہ دارانہ نظام تباہی سے دوچار ہوتا نظر نہیں آ رہا، اس لیے کہ ہمارا حکمران طبقہ نام کا مسلمان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مغرب کے استحصالی سرمایہ دارانہ نظام پر پوری طرح ایمان لایا ہوا ہے۔

قائداعظم چاہتے تھے کہ ہمارا معاشی نظام امیر کو امیر تر، اور غریب کو غریب تر نہ بنائے، مگر پاکستان کی فوجی اور سول اجلافیہ نے جو معاشی نظام ملک و قوم کو دیا ہے وہ امیروں کو امیر تر اور غریبوں کو غریب تر بنائے چلا جا رہا ہے۔ اعداد و شمار کے مطابق اس وقت ملک کی 40 فیصد آبادی خطِ غربت سے نیچے پڑی سسک رہی ہے۔ اس آبادی کو نہ تعلیم میسر ہے، نہ صحت کی سہولتیں فراہم ہیں، نہ پینے کا صاف پانی دستیاب ہے۔ یہ غربت کی اس قسم میں مبتلا لوگ ہیں جس کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ انسان کو کفر تک لے جا سکتی ہے۔ قائداعظم نے اسی طبقے کی بہتری کے لیے اپنے خون کو پانی بنایا، مگر پاکستان کا حکمران طبقہ ان غریبوں کے لیے ایک آنسو بہانے پر بھی آمادہ نہیں ہے۔ ہمارے ''جرنیلوں''، ہمارے ''شریفوں''، ہمارے ''بھٹوؤں''، اور ہمارے ''عمران خانوں'' نے مل جل کر غریبوں کو غربت کے جہنم میں جھونکا ہوا ہے۔

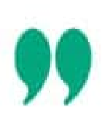
قائداعظم چاہتے تھے کہ ہم معاشی طور پر کسی کے غلام نہ ہوں، مگر ہمارے ''سفاک جرنیلوں''، ہمارے ''سفاک شریفوں''، ہمارے ''سفاک بھٹوؤں'' اور ہمارے ''سفاک عمران خانوں'' نے ملک و قوم کو آئی ایم ایف کا غلام بنایا ہوا ہے۔ انہوں نے ہمیں عالمی بینک کی ماتحتی میں دیا ہوا ہے۔ انہوں نے ملک پر 100 ارب ڈالر سے زیادہ قرضوں کا بوجھ لاد دیا ہے۔ اب ہم اپنا بجٹ بھی خود نہیں بناتے بلکہ آئی ایم ایف کے ماہرین بناتے ہیں۔ اب ہم اپنی بجلی اور گیس کے نرخ خود نہیں گھٹاتے بڑھاتے، بلکہ ہم آئی ایم ایف کے کہنے پر ایسا کرتے ہیں۔ اب ہمارے محصولات کا ہدف آئی ایم ایف طے کرتا ہے۔ اب ہماری اسٹیبلشمنٹ بھی آئی ایم ایف اور عالمی بینک سے ماہرین ''درآمد'' کرتی ہے اور اس پر فخر کرتی ہوئی پائی جاتی ہے۔

ہمارے جرنیل غلام ابنِ غلام ہیں۔ ہمارے شریف غلام ابنِ غلام ہیں۔ ہمارے بھٹوز غلام ابنِ غلام ہیں۔ ہمارے عمران خان غلام ابنِ غلام ہیں...... اور غلام ابنِ غلاموں نے 22 کروڑ لوگوں کو بھی سیاسی اور معاشی اعتبار سے غلام ابنِ غلام بنا دیا ہے۔ ہمارے والدین بھی مغرب کے مالیاتی اداروں کے غلام تھے، ہم بھی مغرب کے مالیاتی اداروں کے غلام ہیں، اور ہماری آنے والی نسلیں بھی مغرب کے مالیاتی اداروں کی غلام ہوں گی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو پاکستان کی حکمران اجلافیہ پاکستان، اس کے نظریے، اس کے بانی، اور ان کے وژن کی غدار ہے...... کھلی غدار۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ جاگیردار اور وڈیرے صرف بڑی زمینوں کے مالک ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ہمارے جرنیل ''فوجی وڈیرے'' ہیں۔ ہمارے ''شریف''، ہمارے ''بھٹوز''، ہمارے ''عمران خان''، ہمارے ''الطاف حسین'' سیاسی وڈیرے ہیں...... اور وڈیروں کی یہ تمام اقسام غریبوں کا استحصال کر رہی ہیں۔ اور ایسا کر کے وہ قائداعظم کا منہ چڑا رہے ہیں۔ وہ قائداعظم کے افکار و نظریات کی توہین کر رہے ہیں۔

ہمارے سرمایہ داروں کی اکثریت کا خدا پیسہ ہے۔ انہیں اپنے اپنے محنت کشوں کی فلاح و بہبود سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ وہ ایک لمحے میں جب چاہیں انہیں کان سے پکڑ کر نوکری سے برطرف کر دیتے ہیں۔

ایک وقت تھا کہ پاکستان کے معاشی امکانات کے آگے سری لنکا اور مالدیپ کیا، بھارت بھی کچھ نہیں بیچتا تھا۔ ہماری فی کس آمدنی بھارت سے زیادہ تھی۔ ہماری کرنسی بھارت کی کرنسی سے کہیں زیادہ مضبوط تھی۔ ہماری برآمدات بھارت کی برآمدات سے کہیں زیادہ بہتر تھیں، اور بین الاقوامی منڈیوں میں ان کی



**ہمارے جرنیل غلام ابنِ غلام ہیں۔ ہمارے شریف غلام ابنِ غلام ہیں۔ ہمارے بھٹوز غلام ابنِ غلام ہیں۔ ہمارے عمران خان**



**غلام ابنِ غلام ہیں......اور غلام ابنِ غلاموں نے 22 کروڑ لوگوں کو بھی سیاسی اور معاشی اعتبار سے غلام ابنِ غلام بنادیا ہے**



ساکھ بھارتی برآمدات سے کہیں بہتر تھی۔ مگر پاکستان کے حکمران طبقے نے قائداعظم کے پاکستان کا کیا حال کردیا ہے، آیئے دیکھتے ہیں۔ 2018ء میں پاکستان کی برآمدات 23 ارب ڈالر تھیں، جب کہ اس عرصے میں بنگلہ دیش کی برآمدات 39 ارب ڈالر سے زیادہ تھیں۔ سری لنکا جس کی آبادی دو کروڑ اور رقبہ صرف 65 ہزار مربع کلومیٹر ہے، اُس کی برآمدات بھی 12 ارب ڈالر تھیں۔ اس عرصے میں بھارت کی برآمدات 536 ارب ڈالر تھیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک پاکستان کے زرِمبادلہ کے ذخائر صرف 17 ارب ڈالر تھے، جبکہ بنگلہ دیش کے زرمبادلہ کے ذخائر 31 ارب ڈالر تھے۔ سری لنکا جو آبادی اور رقبے میں ہم سے کئی گنا چھوٹا ہے اُس کے زرمبادلہ کے ذخائر بھی 8 ارب ڈالر، جبکہ بھارت کے زرمبادلہ کے ذخائر 501 ارب ڈالر تھے۔ 2018ء میں پاکستان کی مجموعی قومی پیداوار 315 ارب ڈالر تھی، جب کہ بھارت کی مجموعی قومی پیداوار 2700 ارب ڈالر تھی۔ بنگلہ دیش جس نے ہم سے بہت بعد میں معاشی ترقی کا سفر شروع کیا، اُس کی مجموعی قومی پیداوار 274 ارب ڈالر یعنی ہم سے تھوڑی سی ہی کم تھی۔ سری لنکا ہم سے آبادی میں دس گنا اور رقبے میں 9 گنا چھوٹا ہے، مگر اس کی مجموعی قومی پیداوار بھی 88 ارب ڈالر تھی۔ یہ حقیقت راز نہیں کہ ہمارے حکمران طبقے کا مذہب اسلام نہیں، بلکہ مال و دولت اور معاشی ترقی ہے۔ مگر یہ طبقہ اپنے مذہب کے ساتھ بھی کوئی بڑی وابستگی نہیں رکھتا۔ رکھتا، تو پاکستان آج دنیا کے خوشحال ممالک میں شمار ہورہا ہوتا۔ پاکستان دنیا کے دس طاقت ور ممالک اور بیس بڑی معیشتوں میں سے ایک ہوتا۔ کون سی دولت اور نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو نہیں دی؟ زرخیز زمین دی، معدنی وسائل دیے۔ ان سے بڑھ کر محنت کرنے والے لوگ دیے۔ ایسی صلاحیتوں کے حامل لوگ دیے کہ جو ملک سوئی نہیں بناتا تھا اس نے ایٹم بم بناکر دکھادیا۔ اگر ہم ایٹم بم بناکر ایٹمی دھماکے کرسکتے ہیں تو قائداعظم کے معاشی تصورات کے مطابق بہت بڑا معاشی دھماکہ بھی کرسکتے تھے۔

یہ ہے وہ اصل اور وسیع پس منظر جس کے تناظر میں رواں مالی سال، گزشتہ سال اور ہر سال کے قومی بجٹ کو دیکھا جانا چاہیے۔ اس تناظر کے بغیر ہمیں نہ قائداعظم کے معاشی تصورات کی توہین اور تذلیل نظر آسکتی ہے، نہ آئی ایم ایف کے پھانسی گھاٹ پر لٹکا ہوا غلام، مقروض اور غریب پاکستان ہمیں نظر آسکتا ہے۔ جیسا کہ قوم جانتی ہے عمران خان کی حکومت نے آئی ایم ایف کا تیار کیا ہوا رواں مالی سال کا بجٹ قومی اسمبلی میں پیش کردیا ہے۔ اس بجٹ کے مندرجات کو سنتے یا پڑھتے ہوئے کسی بھی پاکستانی کو منیر نیازی کا یہ شعر یاد آسکتا ہے۔

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اُس نے کیا

یہاں ''اُس'' سے مراد امریکہ بھی ہے، ''آئی ایم ایف'' بھی، ''عالمی بینک بھی''، ''فوجی اسٹیبلشمنٹ بھی''، ''شریفین'' بھی، ''بھٹوز'' بھی، ''عمران خان'' بھی۔

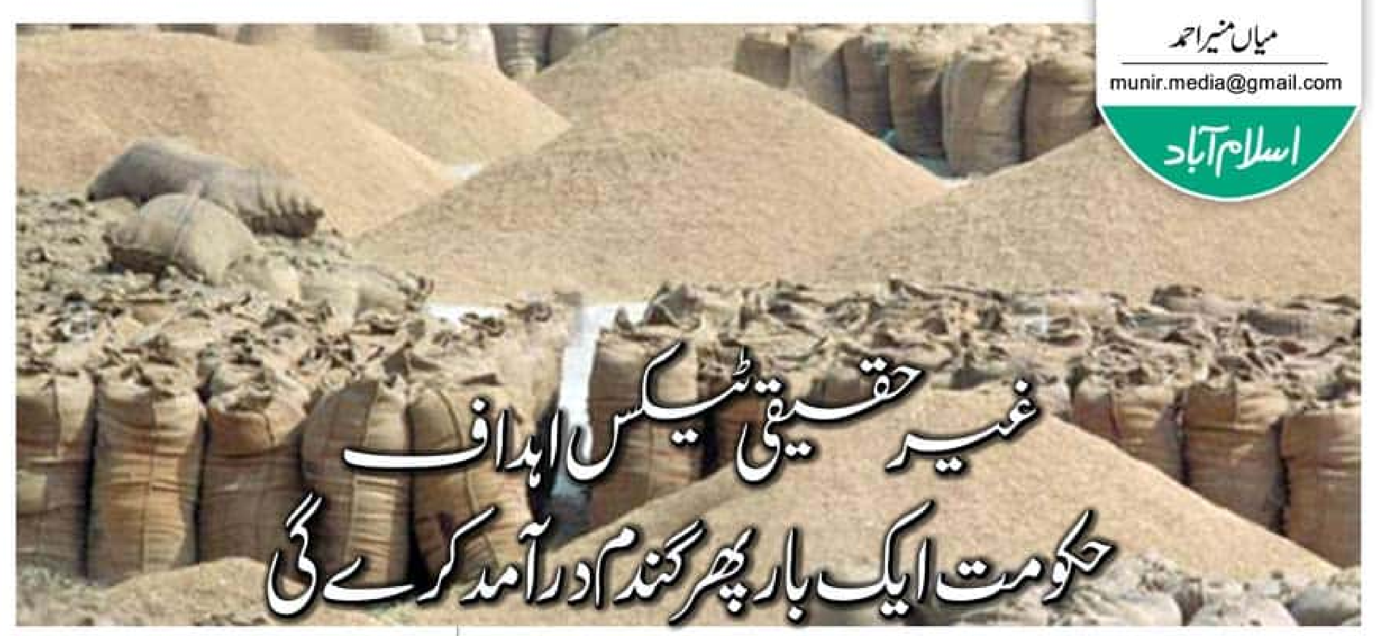
آئندہ مالی سال کے بجٹ کے کئی اہم پہلو ہیں۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے جب قوم نے مادی عروج حاصل کیا ہے تعلیم اور صحت کے شعبوں کو مستحکم کرکے حاصل کیا ہے۔ چین اس کی حالیہ اور سب سے بڑی مثال ہے۔ چین نے معیشت کے دائرے میں جو ''معجزہ'' کر دکھایا ہے اُس کی بنیاد تعلیم میں چین کی غیر معمولی پیش رفت ہے۔ لوگ کہہ رہے ہیں کہ چین چالیس سال میں دنیا کی دوسری بڑی معیشت بن کر ابھر آیا ہے۔ اس کے پاس زرمبادلہ کے سب سے بڑے ذخائر ہیں۔ اس نے 70 کروڑ لوگوں کو غربت کے شکنجے سے نکالا ہے۔ لیکن جو بات کم ہی کہیں کوٹ ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ چین نے امریکہ کو معیشت کے دائرے میں ہی نہیں، تعلیم کے دائرے میں بھی چیلنج کردیا ہے۔ ایک خبر کے مطابق اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ تحقیقی مقالے امریکی نہیں، چینی اسکالر لکھ رہے ہیں۔ چین نے 5G ٹیکنالوجی میں امریکہ کو پیچھے چھوڑ دیا ہے، اور اب کھسیانا امریکہ 5G کے کھمبے نوچنے کے سوا کچھ نہیں کرپارہا۔ چین مادی علوم وفنون میں کمال نہ کرتا تو وہ کسی بھی شعبے میں کہیں نہ ہوتا۔ مگر ہمارا قومی بجٹ ہمیں بتارہا ہے کہ اس بجٹ میں تعلیم کے لیے بمشکل 2 فیصد رقم مختص کی گئی ہے۔ اسی طرح صحت کے شعبے کے لیے 1.1 فیصد رقم مہیا کی گئی ہے۔ اس سے ہمارے حکمرانوں کی ''قومی ترجیحات'' اور ''سمتِ سفر'' کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ گزشتہ مالی سال اور آئندہ مالی سال کے قومی میزانیوں کا سب سے بڑا ''اسکینڈل'' یہ ہے کہ ہم نے صرف دو برسوں میں غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی پر تقریباً 6000 ارب روپے خرچ کیے ہیں۔ جبکہ گزشتہ اور آئندہ مالی سال کے ترقیاتی منصوبوں پر تقریباً 1500 ارب روپے خرچ کیے گئے ہیں۔ ان اعدادوشمار سے ثابت ہے کہ پاکستان کا حکمران طبقہ کتنا بڑا قومی مجرم ہے۔ اس طبقے نے غیر ملکی قرض کو اتنا بڑھادیا کہ وہ ہر سال ہمارا تقریباً نصف بجٹ کھا جاتا ہے۔ تشویش ناک بات یہ ہے کہ بیرونی قرضے مسلسل بڑھ رہے ہیں۔ ایک جرائم پیشہ نوازشریف تھا جس نے صرف چار سال میں بیرونی قرض میں 35 ارب ڈالر کا ہولناک اضافہ کیا۔ دوسرا بڑا مجرم عمران خان ہے جس نے اپنی حکومت کے ابتدائی سات ماہ میں اتنا قرض لیا جتنا پاکستان نے ابتدائی 38 سال میں لیا تھا۔ ایکسپریس ٹریبون کے مطابق عمران خان کی حکومت نے پہلے سال میں 10.4 ارب ڈالر کا قرض لیا۔

پاکستان کے حکمران طبقے کی مجرمانہ روش کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ اب ہمیں غیر ملکی قرضوں کی ادائیگی کے لیے بھی قرض لینا پڑتا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ کورونا نے پوری دنیا میں ایک معاشی بحران پیدا کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے پیرس کلب نے 1.8 ارب ڈالر کے قرضوں کی ادائیگی ایک سال کے لیے مؤخر کردی ہے، ورنہ ہماری معاشی حالت اتنی خستہ تھی کہ ہم پیرس کلب کے قرض کی ادائیگی کے لیے کہیں سے قرض حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ قرض ایک ایسا بوجھ ہے جو افراد اور قوموں کی کمر توڑ دیتا ہے، مگر پاکستان کے حکمران طبقے نے قرض کو ایک نشہ بنالیا ہے۔ اس سلسلے میں فوجی اور سول کی کوئی تخصیص نہیں۔ پاکستان کے تمام حکمران قرض کا نشہ کرتے ہیں۔ اس نشے نے ہمیں زندہ درگور کردیا ہے۔ بدقسمتی سے بجٹ کے اعداد وشمار اتنے پیچیدہ ہوتے ہیں کہ ان سے حقیقتِ احوال سامنے نہیں آپاتی۔ چنانچہ ہم بجٹ کے معاملات کو ایک سیدھی مثال کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرض کیجیے ہمارا مجموعی بجٹ 100 روپے ہے۔ اس بجٹ میں سے 50 روپے ہم نے قرضوں کی ادائیگی پر خرچ کردیے۔ اب ہمارے پاس بچے صرف 50 روپے۔ 50 روپے میں سے 25 روپے دفاع پر خرچ کردیے گئے۔ اس کے نتیجے میں ہمارے پاس باقی بچے صرف 25 روپے۔ اب ان 25 روپے میں ہمیں پورے سال پورا ملک چلانا ہے۔ اس رقم سے ہمیں ''ترقیاتی کام'' بھی کرنے ہیں اور تنخواہیں بھی ادا کرنی ہیں۔ یہ ہے ہماری معاشی صورتِ حال کا لب لباب۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس منظرنامے میں کہیں ''ترقی'' کا کوئی امکان ہوسکتا ہے؟ کیا ہم کبھی اپنی تعلیمی صورتِ حال کو بہتر بناسکتے ہیں؟ کیا ہم کبھی صحت کی سہولتوں میں اضافے کے قابل ہوسکتے ہیں؟ کیا ہم اپنی آئندہ نسلوں کی بہتری کے لیے کوئی بڑا منصوبہ شروع کرسکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ یہی قائداعظم کے معاشی افکار کی توہین ہے۔ یہی معاشی غلامی ہے۔ یہی آئی ایم ایف کے پھانسی گھاٹ پر لٹکا ہوا غلام، مقروض اور غریب پاکستان ہے۔

میاں منیر احمد

munir.media@gmail.com

اسلام آباد

# غیر حقیقی ٹیکس اہداف
# حکومت ایک بار پھر گندم درآمد کرے گی

حکومت نے مالی سال 21-2020ء کے لیے پارلیمنٹ میں 3437 ارب روپے خسارے کا بجٹ پیش کر دیا ہے، وفاقی میزانیے کا حجم 7294 ارب روپے ہے۔ حکومت کے نکتہ نظر سے بجٹ کے نمایاں خدوخال یہ ہیں کہ عوام کو ریلیف کی فراہمی کے لیے کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا گیا۔ کورونا اخراجات اور مالیاتی خسارے کے مابین توازن قائم رکھا جائے گا، پرائمری بیلنس کو مناسب سطح پر رکھا جائے گا، احساس پروگرام جاری رہے گا اور آئی ایم ایف پروگرام میں رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ حکومت کے اپنے ادارے کے مطابق کورونا کے متاثرین کے لیے ایک کھرب روپے چاہئیں۔ یہ کیسے ہوگا؟ بجٹ دستاویز کہتی ہے کہ بجٹ تجاویز پر عمل درآمد کے لیے حکومت 13 ارب 15 کروڑ ڈالر قرض لے گی۔ پروجیکٹ لونز کی مد میں ایک ارب 32 کروڑ ڈالر، قرض پروگرام کی مد میں 3 ارب ڈالر، اور غیر ملکی مالیاتی اداروں سے 8 ارب 80 کروڑ ڈالر کا قرض لیا جائے گا۔ حکومت اسلامک ڈویلپمنٹ بینک سے ایک ارب ڈالر، سعودی عرب سے ایک ارب ڈالر کا ادھار تیل، ڈیڑھ ارب ڈالر یورو بانڈز اور سکوک بانڈز جاری کر کے قرضے حاصل کرے گی۔ کورونا کے پیش نظر صحت کے زیادہ فنڈز مہیا کرنے چاہیے تھے، مگر تلخ حقیقت یہ ہے کہ آئی ایم ایف کی پاکستان کو 6 ارب ڈالر کی توسیعی فنڈ سہولت اُسی وقت بحال ہوگی جب حکومت آئی ایم ایف کے میکرو اکنامک فریم ورک کے مطابق بجٹ پیش کرے گی۔ لہٰذا بجٹ میں وہی رکھا گیا جو آئی ایم ایف کے لیے قابل قبول تھا۔ آئی ایم ایف کے مطابق پاکستان کے مجموعی قرضے اور واجبات 42820 ارب روپے تک پہنچ چکے ہیں۔ یہ جی ڈی پی کا 98.2 فیصد ہیں، اور رفتار یہی رہی تو یہ قرضے جی ڈی پی کے 100 فیصد کے برابر ہو جائیں گے۔ تحریک انصاف کی حکومت کے دو سال میں اندرونی اور بیرونی قرضوں میں 12 ہزار ارب روپے کا اضافہ ہوا ہے۔ قرضوں میں گزشتہ سال 3500 ارب، اور موجودہ سال 8800 ارب روپے کا اضافہ ہوا۔ وزارتِ خزانہ کے مطابق 8.8 ٹریلین قرضے میں سے 5 ٹریلین وفاقی بجٹ کے خسارے کو پورا کرنے کے لیے لیا گیا، جبکہ 1.2 ٹریلین غیر ملکی ذخائر میں اضافہ کرنے کے لیے لیا گیا۔

وفاقی بجٹ 21-2020ء وبا کی وجہ سے لوگوں کی کم توقعات کے باعث حکومت کے لیے ملک کو درپیش دیرینہ مسائل کی تصحیح کرنے کا ایک نادر موقع تھا، لیکن یہ بجٹ جامع حکمت عملی سے عاری ہے۔

بجٹ میں ٹیکس اہداف موجودہ حالات میں غیر حقیقی ہیں، توانائی کے شعبے میں جو سبسڈی کم کی گئی ہے اس سے بجلی کے نرخوں میں اضافہ ہوگا، جبکہ پیٹرولیم لیوی میں اضافے کا مطلب ہے کہ حکومت بین الاقوامی منڈی میں تیل کی قیمت میں کمی کا زیادہ فائدہ عوام کو پہنچانے میں سنجیدہ نہیں ہے۔ ٹڈی دل کی وجہ سے گندم کی فصل کو 2 ملین سے زیادہ کا نقصان ہوا ہے، اب گندم بھی درآمد کرنی پڑے گی۔ جبکہ اس بجٹ میں موسمیاتی تبدیلیوں جیسے اہم موضوع کو بھی نظرانداز کیا گیا ہے، جبکہ آنے والے مون سون میں سیلاب کے خطرات بھی لاحق ہیں۔ اگلے مالی سال میں مہنگائی بہت بڑھ سکتی ہے۔ پاکستان کو بھی اپنے بجٹ بنانے کے عمل کو دنیا میں تیزی سے تبدیل ہوتے حالات کے مطابق ڈھالنا چاہیے، جس کے مطابق بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے بھی سوالات پوچھے جا سکیں۔

تحریک انصاف کی حکومت کا یہ دوسرا سالانہ بجٹ ہے، تاہم اگر منی بجٹ بھی شامل کر لیے جائیں تو اس حکومت کا یہ پانچواں بجٹ ہے۔ ان پانچوں بجٹ میں تعمیراتی انڈسٹری سے وابستہ مافیا اور اشرافیہ کے لیے مراعات ہیں جبکہ مزدوروں اور عوام کے لیے رعایت اور آسودگی کی کوئی صورت بجٹ میں کہیں بھی نظر نہیں آ رہی۔ نجی تعمیراتی شعبے کو مراعات دی گئی ہیں، اس کے لیے سیمنٹ بھی سستا کیا گیا ہے اور ود ہولڈنگ ٹیکس میں چھوٹ دے کر اسے صنعت کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس شعبے کو حکومت اپنے پچاس لاکھ گھروں کی تعمیر کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے، تاہم 'نیا پاکستان ہاؤسنگ' کے لیے تیس ارب رکھے گئے ہیں۔ اس کی تفصیلات ابھی تک سامنے نہیں آ سکی ہیں۔ بجٹ میں زرعی شعبہ حکومت کی توجہ حاصل نہیں کر سکا، اس کی ترقی کا ہدف 2.9 فیصد مقرر کیا گیا ہے۔ ہماری زرعی اجناس کی ملکی ضرورت اس سے بڑھ کر ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ حکومت ایک بار پھر گندم باہر سے منگوائے گی۔ بنیادی طور پر یہ بجٹ آئی ایم ایف کے اسی 39 ماہ کے پروگرام کا حصہ ہے جس پر حکومت نے دستخط کر رکھے ہیں۔ آئی ایم ایف نے اس معاہدے کے تحت 6 ارب ڈالر حکومت پاکستان کو دینے ہیں اور اس کی ہر قسط دیا ہوا ہوم ورک دکھا کر ہی ملنی ہے۔ بجٹ میں وفاقی اخراجات کا کُل تخمینہ 7137 ارب روپے دکھایا گیا ہے، جس کے لیے 2223 ارب روپے کے غیر ملکی قرضے حاصل کیے جائیں گے۔ بجٹ میں وفاقی وزارتوں کے لیے 476 ارب روپے مختص کیے گئے ہیں۔ این ایف سی ایوارڈ کے تحت وفاق صوبوں کو 2874 ارب روپے دے گا۔ بجٹ میں پنشن کی ادائیگی کے لیے 470 ارب اور سبسڈیز کے لیے 210 ارب روپے تجویز کیے گئے ہیں۔

معاشی حالات کے پیش نظر جی ڈی پی گروتھ 2.1، کرنٹ اکاؤنٹ خسارہ 1.6 اور مہنگائی کی شرح ساڑھے چھ فیصد پر لانے کا ہدف، معاشی ترقی کا ہدف 2.1 مقرر، براہ راست بیرونی سرمایہ کاری میں پچیس فیصد تک اضافے کا ٹارگٹ رکھا گیا ہے۔ مقامی صنعتی شعبے میں نمو کا ہدف 0.1 فیصد رکھا گیا ہے، اور مقامی صنعتوں پر ڈیوٹی بارہ سے کم کر کے چھ فیصد کر دی گئی۔ تاہم بجلی، گیس کے نرخ کم نہیں کیے گئے، اسی وجہ سے ڈیوٹی میں رعایت کے باوجود صنعتی شعبے میں ترقی نہیں ہوگی۔

بجٹ اجلاس کی خاص بات یہ ہے کہ حکومت اور اپوزیشن کی دو بڑی پارلیمانی جماعتوں مسلم لیگ (ن) اور پاکستان پیپلز پارٹی نے ایس او پیز کے جن رہنما اصولوں پر اتفاق کیا ہے اس کے تحت سرکاری بینچوں پر 46 اور اپوزیشن بینچوں پر 40 ارکان بیٹھیں گے۔ یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ کٹوتی کی تحریکوں پر زور نہیں دیا جائے گا، نہ بجٹ کی منظوری سے قبل کورم کی نشاندہی کی جائے گی۔ جمعیت علمائے اسلام (ف) نے اس سمجھوتے کو مسترد کر دیا ہے، مگر اس کے باوجود بجٹ آسانی سے منظور ہو جائے گا۔

●●



تاثیر مصطفیٰ
taseermustafa@hotmail.com

رپورٹ

## وفاقی بجٹ 2020-21ء

# تین بڑے اعتراضات

**دفاعی بجٹ کا وسیع حجم، صحت اور تعلیم کے لیے انتہائی کم رقم، اور سرکاری ملازمین کی تنخواہوں اور پنشن میں کوئی اضافہ نہ ہونا ہے**

ملکی تاریخ کا ایک اور بجٹ ایک بار پھر اس حکومتی دعوے کے ساتھ قومی اسمبلی کے محدود اجلاس میں پیش ہوگیا کہ ان حالات میں اس سے بہتر بجٹ پیش ہی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ حکومتی وزرا نے اِس بار بھی وہی روایتی تعریفی ڈونگرے برسائے جو اس ملک میں گزشتہ 73 برس سے وزرا برساتے آرہے ہیں۔ ہماری پوری پارلیمانی تاریخ میں ایک بھی ایسی مثال موجود نہیں کہ کسی وزیر نے ہمت کرکے بجٹ کی کسی خرابی کی نشان دہی کی ہو۔ اپوزیشن نے ہر سال کی طرح اس بار بھی پہلے بجٹ تقریر کے دوران شور شرابہ کیا، پھر بجٹ کو مسترد کرتے ہوئے واک آؤٹ کردیا۔ البتہ اس بار ایک نیا کام یہ ہوا کہ اپوزیشن نے اپنے احتجاج کی ویڈیو بناکر میڈیا کو جاری کردی۔ اس سے قبل انہیں اپنے احتجاج کی تصویری جھلکیاں نشر نہ ہونے پر اعتراض اور شکایت ہوتی تھی۔ سرکاری اور نجی میڈیا پر حکومتی دانشوروں نے بجٹ کے ایسے ایسے روشن پہلو تلاش کرلیے جن کا خود حکومت کو بھی علم نہیں تھا، اور مخالف دانشوروں نے ایسی ایسی خرابیاں ڈھونڈ نکالیں جو کسی دوربین سے بھی تلاش کرنا مشکل ہوتیں۔

یہ بات درست ہے کہ اِس وقت ملک مشکل ترین صورتِ حال، بلکہ حالتِ جنگ جیسی ایمرجنسی سے گزر رہا ہے۔ کورونا کی تباہیاں اور معیشت کی بربادی سب کے سامنے ہے، لیکن ایسے مواقع پر حکومتیں اپوزیشن کو اعتماد میں لے کر ایسا بجٹ پیش کرتی ہیں جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو، اور دنیا کو یہ پیغام جائے کہ مشکل کی اس گھڑی میں قوم یکجا ہے۔ لیکن ایسا کرنا شاید اس حکومت کے مزاج ہی میں شامل نہیں ہے۔ بجٹ سے قبل حکومت نے اپوزیشن رہنماؤں، سیاسی جماعتوں اور ماہرین کو سے مشاورت کرنا مناسب ہی نہیں سمجھا، بلکہ بجٹ کی تیاری کے دنوں میں نیب کے ذریعے اپوزیشن رہنماؤں اور جماعتوں کو دباؤ میں لانے کی کوششوں میں مصروف رہی، حالانکہ حکومت کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ہماری اپوزیشن خاصی تجربہ کار ہے، اسے دباؤ قبول کرنا ہوگا تو وہ سلیکٹرز کا دباؤ مانے گی۔ سلیکٹڈ کا دباؤ کیوں قبول کرے گی! حکومت نے تو بجٹ سے قبل اپنی اتحادی جماعتوں ایم کیو ایم اور مسلم لیگ (ق) کو بھی کافی زچ کیا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ ان جماعتوں نے بدلہ چکانے کے بجائے خاموش رہنے کو ترجیح دی۔ اس سب کے باوجود سب جانتے ہیں کہ بجٹ منظور ہوجائے گا اور حکومت اور اپوزیشن کی کھینچا تانی چلتی رہے گی، ایمپائر کی انگلی کھڑی ہونے تک۔

وفاقی وزیر صنعت و پیداوار حماد اظہر نے بجٹ پیش کرتے ہوئے یہ تو فخر سے بتادیا کہ یہ ٹیکس فری بجٹ ہے اور اس میں کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا گیا، مگر یہ بات گول کرگئے کہ ملکی تاریخ میں سب سے زیادہ خسارے والا بجٹ بھی یہی ہے۔ 2020-21ء کے وفاقی بجٹ کا کُل حجم 71 کھرب 37 ارب روپے ہے جو 3437 ارب روپے کے خسارے کے ساتھ ہے۔

حکومت اور اس کے اتحادی اور ترجمان اس بات پر تنتے پھر رہے ہیں کہ ان حالات میں کوئی نیا ٹیکس نہیں لگایا گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا پہلے لگے ہوئے ٹیکس کم ہیں جو نئے لگانے کی گنجائش پیدا کی جاتی؟ گزشتہ دس سال میں پیش ہونے والے تمام بجٹ ٹیکس فری تھے۔ لیکن اب حکومتوں کے پاس اس کا حل ضمنی بجٹ اور بالواسطہ ٹیکس کی صورت میں موجود ہے۔ یہ حکومت بھی پچھلے برسوں کی طرح یہی کرے گی۔ موجودہ بجٹ میں بھی حکومت بالواسطہ ٹیکسوں سے 29 کھرب روپے کمائے گی۔

بجٹ پر جو تین بڑے اعتراضات آئے ہیں وہ دفاعی بجٹ کا وسیع حجم، صحت اور تعلیم کے لیے انتہائی کم رقم، اور سرکاری ملازمین کی تنخواہوں اور پنشن میں کوئی اضافہ نہ ہونا ہے۔ بجٹ میں دفاعی شعبے کے لیے 1289 ملین روپے رکھے گئے ہیں جو یقیناً بہت بڑی رقم ہے، لیکن یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کیا ماضی میں پیش ہونے والے بجٹوں میں بھی اسی شرح سے دفاعی شعبے کے لیے رقم رکھی گئی تھی؟ دوسرا یہ کہ اس کثیر رقم پر اسمبلی میں کوئی نہیں بولے گا، صرف چند چھوٹی جماعتیں احتجاج کریں گی۔ بڑی جماعتیں فوج کو نہ ماضی میں ناراض کرتی تھیں، نہ اب کریں گی۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ ’’ووٹ کو عزت دو‘‘ اور ’’مجھے کیوں نکالا؟‘‘ والے نوازشریف کی جماعت نے بھی آرمی چیف کی مدت ملازمت میں توسیع کے حق میں ووٹ ڈالا تھا کہ مستقبل میں سودے بازی مقصود تھی۔

بجٹ میں سب سے زیادہ رقم ترقیاتی منصوبوں کے لیے 1324 ارب روپے رکھی گئی ہے، البتہ تعلیم اور صحت جو سالہا سال سے ہماری حکومتوں کی ترجیحات میں شامل نہیں ہیں اور وہ ان شعبوں میں نہ صرف نجی شعبے کو دنیا بھر کی مراعات دیتی آئی ہیں بلکہ اس شعبے کی کارکردگی کی تعریف بھی کرتی ہیں، حالانکہ ان دونوں شعبوں کے نجی سیکٹر میں جانے کے بعد جو تباہی آئی ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ حالیہ کورونا بحران کے دوران نجی اسپتالوں نے مریضوں سے ایک ایک دن کا ایک ایک لاکھ روپے تک وصول کیا ہے، لیکن اب بھی حکومت سرکاری شعبے کے اسپتال بنانے کے بجائے ہیلتھ کارڈوں کے چکر میں پڑی ہوئی ہے۔ اس بجٹ میں بھی طبی شعبے کے لیے صرف 75 ارب روپے رکھے گئے ہیں، تاہم کورونا پیکیج کے لیے 1200 ارب روپے ہیں۔ معلوم

> امیر جماعت اسلامی پاکستان سینیٹر سراج الحق نے یہ اہم نکتہ اٹھایا ہے کہ کورونا کے باعث ایک کروڑ سے زائد بے روزگار ہونے والے افراد اور اُن کے اہلِ خانہ کے لیے حکومت نے نہ تو کوئی منصوبہ بندی کی ہے اور نہ بجٹ میں اس کام کے لیے کوئی رقم رکھی ہے حالانکہ یہ سب سے اہم کام ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں بے روزگار ہوجانے والے افراد زندگی کی گاڑی کیسے کھینچیں گے

نہیں کہ کورونا پیکیج میں صرف امدادی رقوم اور مستحقین میں اشیائے ضروریہ کی تقسیم ہی شامل ہے، یا اس میں کورونا کے لیے طبی سہولتوں کی فراہمی کے لیے بھی کچھ رقم مختص ہے!

سب سے زیادہ شور سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ نہ کیے جانے پر ہوا ہے، اور ساتھ ہی پنشن میں اضافہ نہ کیے جانے پر بھی احتجاج کیا جارہا ہے۔ یہ درست ہے کہ سابقہ تمام بجٹوں میں سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں مہنگائی کے باعث اضافہ کیا جاتا رہا ہے جسے عام سرکاری ملازمین اپنی سال بھر کی کارکردگی کا صلہ قرار دیتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر یہ اضافہ نہ کرنے کی حمایت میں دل چسپ تبصرے سامنے آئے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ سرکاری ملازمین سارا سال مفت کی روٹیاں کھاتے ہیں، عوام کو دفتروں کے دھکے کھلواتے ہیں۔ انہوں نے پی آئی اے، واپڈا، ریلوے، ٹیلی فون جیسے منافع بخش محکموں کو کنگال کرکے رکھ دیا ہے اور باقی ادارے بھی تباہی کے دہانے پر لا کھڑے کیے ہیں۔ ملک میں دفتری نظام کی ساری خرابیوں، سرکاری محکموں میں رشوت ستانی اور کام چوری کے بعد ان کی تنخواہوں میں اضافے کے بجائے کٹوتی ہونی چاہیے۔ تاہم یہ بات درست نہیں ہے۔ حکومت متذکرہ بالا خرابیوں کو دور کرے، لیکن مہنگائی کے تناسب سے تنخواہوں میں اضافہ بھی کرے جو نہیں کیا گیا۔ بجٹ میں سب سے تکلیف دہ بات پنشن میں اضافہ نہ ہونا ہے۔ عام سرکاری ملازمین کی پنشن ویسے ہی بہت کم ہوتی ہے، ریٹائرمنٹ کے بعد بیماری اور دوسری مشکلات پنشنرز کو پریشان رکھتی ہیں، خصوصاً پنشنرز کی وفات کی صورت میں بیوہ مزید پریشانیوں کا شکار ہوجاتی ہیں، اس لیے اس طبقے کے لیے ریلیف کی واقعی ضرورت تھی جو حکومت نے فراہم نہیں کی۔

بجٹ پر سب سے اہم اور پریشان کن تنقید دینی مدارس کی جانب سے آئی ہے۔ وفاق المدارس العربیہ نے مدارس اصلاحات کے نام پر 5 ارب روپے کی خطیر رقم مختص کرنے کی مذمت کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کورونا بحران کے دوران بھی حکومت نے مدارس اور مساجد کے بجلی اور پانی کے بل معاف نہیں کیے، عام حالات میں بھی انھیں کوئی رعایت نہیں دی جاتی، کورونا بحران میں مدارسِ دینیہ کے اساتذہ اور طلبہ کے لیے حکومت نے کسی امدادی ریلیف کو ضروری نہیں سمجھا، اب اصلاحِ مدارس کے نام پر یہ خطیر رقم مدارس کے نظام میں مداخلت اور کوئی غیر ملکی ایجنڈا ہے۔

آخری اطلاعات کے مطابق تنخواہوں میں اضافہ نہ کرنے پر سرکاری ملازمین نے مختلف شہروں میں احتجاج شروع کردیا ہے، جبکہ مشیر خزانہ حفیظ شیخ نے کہہ دیا ہے کہ بجٹ میں ضرورت کے تحت ردوبدل ہوسکتا ہے، یعنی منی بجٹ آسکتے ہیں۔

بجٹ کے اعلان کے ساتھ ہی اشیائے ضروریہ کی قیمتوں میں اضافہ ہوگیا ہے۔ پیٹرول پہلے ہی نہیں مل رہا تھا، اب آٹا، دودھ، دالوں اور مسالہ جات کی قیمتوں میں اضافہ شہریوں کے لیے مزید پریشانی کا باعث بن رہا ہے کہ بہت سے شہریوں کی تنخواہوں میں کٹوتیاں ہورہی ہیں، بہت سوں کے کاروبار بند پڑے ہیں، کئی کو نوکریوں سے نکال دیا گیا ہے...... لیکن حکومت صرف تقریریں کررہی ہے۔ بجٹ کے اعلان کے ساتھ ہی قیمتوں پر کنٹرول کے لیے ایک واضح لائحہ عمل کی ضرورت تھی جو حکومت نے نہیں اپنایا۔ شاید اسی لیے نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان نے کہا ہے کہ موجودہ بجٹ عالمی مالیاتی اداروں کے اہداف کا پلندہ ہے، اس میں عوام کے لیے کچھ نہیں۔ امیر جماعت اسلامی پاکستان سینیٹر سراج الحق نے یہ اہم نکتہ اٹھایا ہے کہ کورونا کے باعث ایک کروڑ سے زائد بے روزگار ہونے والے افراد اور اُن کے اہلِ خانہ کے لیے حکومت نے نہ تو کوئی منصوبہ بندی کی ہے اور نہ بجٹ میں اس کام کے لیے کوئی رقم رکھی ہے حالانکہ یہ سب سے اہم کام ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں بے روزگار ہوجانے والے افراد زندگی کی گاڑی کیسے کھینچیں گے۔ یہ بے روزگار افراد، ان کے اہلِ خانہ دو وقت کی روٹی کہاں سے کھائیں گے؟ علاج کے دروازے تو پہلے ہی بند ہیں کہ اسپتالوں میں گنجائش نہیں، یہ بے چارے تو اپنے مریضوں کو اسپتال بھی نہیں پہنچا سکیں گے، اور خدانخواستہ موت کی صورت میں ان کی تدفین بھی کرنے کے قابل نہ ہوں گے۔ حکومت کو غور کرنا چاہیے کہ بڑے شہروں میں لاکھوں افراد دو، دو نوکریاں کرکے اپنے خاندان کی کفالت کررہے تھے، اب ان کی ایک، اور بعض کی دونوں نوکریاں ختم ہوگئی ہیں، سیٹھ کسی کو گھر بٹھا کر تنخواہ دینے کو تیار نہیں، حکومت اس پر کوئی دباؤ بھی نہیں ڈال رہی۔ ایسے میں یہ لوگ زندہ کس طرح رہیں گے! کاش ہمارے اربابِ اقتدار زمینی حقائق کو دیکھیں، عام آدمی کی پہاڑ جیسی مشکلات پر غور کریں، اور اُسے بچانے کی فکر کریں، ورنہ کورونا سے بچنے والے بھوک اور بے روزگاری سے مرنے لگیں گے، اللہ خیر کرے۔

●●




مسعود ابدالی
masood_abdali@hotmail.com

تجزیہ

# سب سے پہلے ”امریکہ“ چچا سام کا عالمی عدالت سے فرار

## اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن اور دوسرے اداروں کی طرح آئی سی سی بھی عضوِ معطل سے زیادہ کچھ نہیں

امریکی انتظامیہ نے جرائم کی عالمی عدالت ICC کے اُن ججوں اور محتسبوں (Prosecutors) پر تادیبی پابندیاں عائد کردیں جنھیں افغانستان میں امریکی فوج کی مبینہ زیادتیوں کی تحقیقات کے لیے نامزد کیا گیا ہے۔ صدر ٹرمپ نے آئی سی سی کی جانب سے امریکی فوج کے طرزِعمل کی تفتیش و تحقیق کو امریکی عوام کی توہین اور قومی خودمختاری پر حملہ قرار دیا ہے۔

عالمی عدالت کی تشکیل کے لیے اقوام متحدہ کے زیر اہتمام اٹلی کے دارالحکومت روم میں دنیا بھر کے سفارت کاروں کا اجتماع جون 1998ء میں منعقد ہوا تھا، جہاں پانچ ہفتے کے بحث مباحثے کے بعد ایک مسودۂ قانون منظور کیا گیا۔ یہ مسودہ قانونِ روم یا Statute of Rome کے نام سے مشہور ہوا۔ قانونِ روم کے تحت ایک عالمی عدالت قائم کی گئی جسے ان بڑے جرائم کی تحقیقات اور سزا سنانے کا اختیار دیا گیا ہے جن کی منصفانہ و شفاف تحقیقات و سماعت مقامی عدالتوں میں ممکن نہ ہو، یا عدالتیں ملزمان کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لیے سنجیدہ نہ نظر آتی ہوں۔

17 جولائی کو قانونِ روم 7 کے مقابلے میں 120 ووٹوں سے منظور ہوا، 21 ممالک نے رائے شماری میں حصہ نہیں لیا۔ رائے شماری ہاتھ اٹھا کر کی گئی تھی۔ ووٹنگ کا حتمی نتیجہ عالمی عدالت کے ریکارڈ میں موجود ہے، لیکن ووٹنگ کی تفصیل محفوظ نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کن ممالک نے قرارداد کی مخالفت میں ووٹ دیا یا غیر جانب دار رہے؟ امریکہ، اسرائیل اور چین نے اُسی وقت اعلان کردیا تھا کہ وہ اس قرارداد کے خلاف ووٹ دے رہے ہیں۔ ایران، ہندوستان، انڈونیشیا، عراق، لیبیا، قطر، روس، سعودی عرب، سوڈان اور یمن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان ملکوں نے قرارداد کے خلاف رائے دی، یا غیر جانب دار رہے۔ تاہم قرارداد پر ووٹنگ سے پہلے ہی اس بات پر اتفاق رائے ہوچکا تھا کہ فیصلہ 'ایک ملک ایک ووٹ' کے اصول پر ہوگا اور مخالفت کرنے والے ممالک کو بھی اکثریت کا فیصلہ تسلیم کرنا ہوگا۔ غیر ضروری طوالت اور دخل در معقولات سے بچنے کے لیے ICC کے اختیارات صرف چار عالمی جرائم یعنی نسل کُشی، انسانیت کے خلاف جرائم، جنگی جرائم اور جارحیت تک محدود ہیں۔ مقدمات تیزی سے نمٹانے کے لیے ان چاروں جرائم کی تحقیقات کے لیے علیحدہ علیحدہ خودمختار معدلہ یا ٹریبونل بھی قائم کردیے گئے۔ عالمی عدالت پر رکن ممالک کا عزم مستحکم کرنے کے لیے یہ طے کیا گیا کہ اتفاق کرنے والے ممالک قرارداد کی اپنی پارلیمان سے توثیق کروائیں گے، اور کم از کم ساٹھ ممالک کی جانب سے توثیق کے بعد ہی عدالتوں کا قیام عمل میں آئے گا۔ 60 ممالک سے توثیق کے بعد یکم جولائی 2002ء کو نیدرلینڈ (ہالینڈ) کے شہر ہیگ (The Hague) میں ICC کی مرکزی بینچ قائم کردی گئی۔ امریکہ اور روس سمیت 79 ممالک کی اسمبلیوں نے ICC کی اب تک توثیق نہیں کی۔ برصغیر اور اس کے پڑوسیوں میں صرف افغانستان اور بنگلہ دیش ICC کے رکن ہیں۔

جرائم کی عالمی عدالت 18 ججوں اور ایک مرکزی محتسبِ اعلیٰ پر مشتمل ہے۔ ملزمان کو دورانِ سماعت قید میں رکھنے کے لیے حوالات بھی ہے جو اپنی سہولتوں کے اعتبار سے اعلیٰ پائے کے پنج ستارہ ہوٹل سے کسی طور کم نہیں۔ اب تک ICC نے 45 افراد پر مقدمے قائم کیے ہیں جن میں لیبیا کے سابق سربراہ کرنل معمر قذافی اور سابق سوڈانی صدر عمر البشیر شامل ہیں، تاہم کوئی بھی مقدمہ حتمی انجام تک نہیں پہنچا، جس کی وجہ سے عدالت کے مؤثر ہونے پر شدید تحفظات ہیں۔

امریکہ سے آئی سی سی کے جھگڑے کا آغاز اُس وقت ہوا جب 20 نومبر 2017ء کو محتسبِ اعلیٰ محترمہ فاتو بِن سودا (Fatou Bensouda) نے عالمی عدالت کے ججوں سے افغانستان میں جنگی جرائم کی تحقیقات کے لیے اجازت طلب کی۔ گیمبیا کی 59 سالہ بن سودا ایک تجربہ کار وکیل اور اپنے ملک کی سابق اٹارنی جنرل ہیں۔ عدالت کے نام درخواست میں محترمہ بن سودا نے کہا کہ محتسبین کی جانب سے ابتدائی جانچ کے بعد آئی سی سی کو ایسے شواہد، آثار اور ثبوت حاصل ہوئے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 2013ء سے 2014ء کے درمیان افغانستان میں بڑے پیمانے پر جنگی جرائم کا ارتکاب کیا گیا، اور چارٹر کے تحت عدالت کو اس پر کارروائی کا اختیار حاصل ہے۔ درخواست میں انھوں نے امریکی فوج، امریکی سی آئی اے، کابل انتظامیہ اور طالبان کے طرزِعمل کی تحقیق کا ارادہ ظاہر کیا۔ ابتدائی تحقیقات کے مطابق اس عرصے کے دوران طالبان کے ہاتھوں وسیع پیمانے پر عام شہریوں کی ہلاکتیں، افغان حکام کی جانب سے قیدیوں پر مبینہ تشدد، اور امریکی افواج و سی آئی اے کی کارروائیوں میں جنگی جرائم کا شائبہ ملتا ہے جس کی تحقیقات ضروری ہے۔

تین سال تک بن سودا صاحبہ کی درخواست مختلف اعتراض لگاکر واپس ہوتی رہی، لیکن محتسب صاحبہ مستقل مزاجی سے اپنی درخواست کو نئے شواہد اور نوک پلک درست کرکے دوبارہ اور سہ بارہ جمع کراتی رہیں۔ چند ماہ پہلے جو ترمیم شدہ مسودہ جمع کرایا گیا

**امریکی وزیرخارجہ مائیک پومپیو نے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آئی سی سی ایک جعلی عدالت ہے جسے ہم تسلیم نہیں کرتے، اور امریکہ کنگرو کورٹ کے نوٹس کی تعمیل کر کے اپنے لوگوں کو خطرے سے دوچار کرنے کو تیار نہیں۔ گزشتہ ہفتے صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ایک صدارتی حکم نامہ جاری کیا ہے جس کے تحت امریکی وزیرخارجہ وزیرخزانہ کے مشورے سے عالمی آئی سی سی کے اُن اہلکاروں کے اثاثے منجمد کر سکتے ہیں، جو امریکی فوج کے خلاف تحقیقات میں ملوث ہیں**

اُس میں بڑی صراحت کے ساتھ امریکی فوج اور سی آئی اے کے خلاف الزامات کو 'کم درجے کی شکایت' قرار دیا گیا ہے۔ سیانے کہہ رہے ہیں کہ ترمیم شدہ درخواست میں امریکی فوج اور سی آئی اے کے خلاف الزامات کے گرد 'کم درجے' کی چھینی جمانے کا مقصد صدر ٹرمپ کے لیے تحقیقات کی کڑوی گولی کو نگلنا آسان بنانا تھا۔ دوسری طرف افغان مُلا شاکی ہیں کہ امریکہ اور سی آئی اے کا ذکر زیبِ داستاں سے زیادہ کچھ نہیں اور تحقیقات کا اصل ہدف طالبان ہیں۔

اِس سال مارچ میں عالمی عدالت نے تحقیقات کی اجازت دے دی، تاہم سنگ دل محبوب 'کم درجے' پر بھی راضی نہ ہوا اور امریکی حکام عالمی عدالت پر برس پڑے۔ انھوں نے الزام لگایا کہ روس نے شام اور لیبیا میں اپنے جرائم سے دنیا کی توجہ ہٹانے کے لیے ہیگ میں قائم ٹریبونل سے ساز باز کر کے امریکی فوج اور سی آئی اے کے خلاف مقدمہ بنوایا ہے جو امریکہ کی سالمیت اور خودمختاری پر براہِ راست حملہ ہے۔ عدالت کی جانب سے تحقیقات کی منظوری کے ساتھ ہی امریکی وزارتِ خارجہ نے اعلان کیا کہ تحریری اجازت کے بغیر امریکی اہلکاروں کی تفتیش غیر قانونی ہے، اور اس میں ملوث آئی سی سی کے ملازمین کے خلاف تادیبی پابندیاں عائد کردی جائیں گی۔ دلچسپ بات کہ تحقیقات کا اصل ہدف ہونے کے باوجود طالبان کی جانب سے کسی منفی ردعمل کا اظہار نہیں ہوا۔ کابل انتظامیہ نے تحقیقات پر کوئی اعتراض نہیں کیا، تاہم ان کا اصرار ہے کہ جنگی جرائم کے خلاف تحقیقات مقامی سطح پر ہونی چاہیے۔ افغانستان آئی سی سی کا رکن اور اس کے فیصلوں پر عمل درآمد کا پابند ہے۔

امریکی وزیرخارجہ مائیک پومپیو نے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آئی سی سی ایک جعلی عدالت ہے جسے ہم تسلیم نہیں کرتے، اور امریکہ کنگرو کورٹ کے نوٹس کی تعمیل کر کے اپنے لوگوں کو خطرے سے دوچار کرنے کو تیار نہیں۔ گزشتہ ہفتے صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ایک صدارتی حکم نامہ جاری کیا ہے جس کے تحت امریکی وزیر خارجہ وزیر خزانہ کے مشورے سے عالمی آئی سی سی کے اُن اہلکاروں کے اثاثے منجمد کر سکتے ہیں، جو امریکی فوج کے خلاف تحقیقات میں ملوث ہیں۔ حکم نامے کی رو سے امریکی وزیر خارجہ آئی سی سی کے متعلقہ ملازمین اور ان کے اہلِ خانہ کے امریکہ میں داخلے پر پابندی عائد کرنے کے بھی مجاز ہیں۔ قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ حالیہ صدارتی حکم نامے سے ایک سال پہلے ہی آئی سی سی کے بہت سے ملازمین پر سفری اور دیگر پابندیاں عائد کی جاچکی ہیں۔

آئی سی سی پر بدعنوانی و رشوت ستانی کا الزام لگاتے ہوئے امریکی اٹارنی جنرل ولیم بار نے دعویٰ کیا کہ ان کے محکمہ انصاف کو آئی سی سی میں مالی بدعنوانی و رشوت ستانی کے ٹھوس ثبوت موصول ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ محتسب کے دفتر میں بہت اعلیٰ سطح پر بے ایمانی اور دھوکہ دہی ایک عرصے سے جاری ہے جس کی وجہ سے مہذب دنیا کو آئی سی سی سے انصاف کی کوئی توقع نہیں۔ وائٹ ہاؤس کی پریس سیکریٹری محترمہ کے مک اینینی نے آئی سی سی کے بارے میں سرکاری مؤقف کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ جنگی جرائم کی جوابدہی کے لیے آئی سی سی کا قیام عمل میں آیا تھا لیکن غیر مؤثر افسر شاہی نے عدالت کو مفلوج کر دیا ہے اور اب مخصوص مفادات کی تکمیل کے لیے امریکی شہریوں اور سرکاری اہلکاروں کو نشانہ بنانے کے ساتھ امریکہ کے اتحادیوں اور شراکت داروں کو دھمکانے کے سوا اس ادارے کا اور کوئی مصرف نہیں۔

افغانستان کے ساتھ آئی سی سی نے غربِ اردن اور غزہ میں اسرائیلی فوج کے ممکنہ جنگی جرائم کی تحقیقات کا اعلان کیا ہے، اور ''غیر جانب داری'' کا گھونگھٹ کاڑھتے ہوئے حماس کو بھی شاملِ تفتیش کیا جارہا ہے۔ حسبِ توقع اسرائیل نے ان تحقیقات کو مسترد کرتے ہوئے آئی سی سی کے اہلکاروں کے اسرائیل آنے پر پابندی لگادی ہے۔ حماس تحقیقات میں تعاون کے لیے تیار نظر آرہی ہے۔

انسانی حقوق کے عالمی ادارے ہیومن رائٹس واچ (HRW) نے امریکی حکومت کے ان اقدامات کی مذمت کرتے ہوئے اسے عالمی قوانین کی توہین قرار دیا ہے۔ ہیومن رائٹس واچ کی واشنگٹن کے لیے قائم مقام ڈائریکٹر اینڈریا پریسو (Andrea Prasow) نے کہا کہ عدم تعاون سے اندازہ ہوتا ہے کہ ٹرمپ انتظامیہ قانون کی حکمرانی پر یقین نہیں رکھتی اور آئی سی سی سے عدم تعاون ایک غیر مہذب طرزِ عمل ہے۔

انسانی حقوق کے علم برداروں کی اس تنقید سے صدر ٹرمپ کے رویّے میں کسی تبدیلی کی کوئی توقع نہیں۔ امریکی صدر امریکی آئین و قانون کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تو عالمی قانون ان کے آگے کیا چیز ہے! انھوں نے مئی 2018ء میں ایران سے کیے گئے جوہری معاہدے JCPOA سے امریکہ کو بیک جنبشِ قلم نکال لیا، حالانکہ برسوں کے اعصاب شکن مذاکرات کے بعد سلامتی کونسل کے پانچوں مستقل ارکان اور جرمنی نے اس معاہدے پر دستخط کیے تھے۔ یورپی یونین بھی مبصر کی حیثیت سے اس تاریخی معاہدے کا حصہ ہے۔ امریکی سینیٹ نے اس معاہدے کی 2 کے مقابلے میں 98 ووٹوں سے توثیق کی، لیکن صدر ٹرمپ نے مشورہ تو دور کی بات، علیحدگی کے اعلان سے پہلے کسی فریق کو مطلع تک کرنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ صدر کے رعب کا یہ عالم ہے کہ امریکہ کے قانون سازوں نے اپنے مینڈیٹ کی توہین خاموشی سے برداشت کرلی۔

امریکی صدر چین، کینیڈا، میکسیکو اور یورپی یونین سے برسوں پرانے تجارتی معاہدے کو ایک حکم کے تحت منسوخ کر چکے ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ 'پیرس معاہدے' کا ہوا جس سے صدر ٹرمپ نے تین سطری اعلان کے ذریعے علیحدگی اختیار کرلی۔ ان کا خیال ہے کہ گزشتہ انتخابات میں عوام نے انھیں 'سب سے پہلے امریکہ' کے نام پر اقتدار عطا کیا ہے، اور امریکہ کو عظیم تر بنانے کے لیے انھیں اپنے فیصلوں کی توثیق یا مشورے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حال ہی میں انھوں نے یہ کہہ کر عالمی ادارۂ صحت سے تعلق توڑ لینے کا عندیہ دے دیا کہ ادارہ امریکہ مخالف اور چین کا حاشیہ بردار ہوگیا ہے۔

عالمی عدالت سے عدم تعاون کے معاملے میں امریکہ اکیلا نہیں۔ روس شام اور کریمیا میں جنگی جرائم کی تحقیقات پر راضی نہیں، جبکہ چین اراکانیوں کی نسل کُشی کی تحقیقات کے لیے میانمر (برما) کی چھان بین کا مخالف ہے۔ اسی طرح اویغور مسلمانوں کے معاملے پر بھی آئی سی سی کو تفتیش کی اجازت نہیں، اور اس معاملے میں پاکستان اور سعودی عرب سمیت ترکی، ملائشیا اور قازقستان کے سوا تقریباً تمام مسلم ممالک چین کے پُرجوش حامی ہیں۔

اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن اور دوسرے اداروں کی طرح آئی سی سی بھی عضوِ معطل سے زیادہ کچھ نہیں، جس کی بنیادی وجہ بڑے ممالک کا تکبر ہے۔ دنیا کو تہذیب، جمہوریت، آزادیِ اظہارِ رائے اور قانون کی حکمرانی کا درس دینے والے خود کو کسی قانون کو پابند نہیں سمجھتے۔ ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' گنگناتے، انسانیت کے کندھوں پر سوار ان پیرانِ تسمہ پا نے دنیا سے انصاف کا جنازہ نکال دیا ہے۔

..................

اب آپ مسعود ابدالی کی پوسٹ اور اخباری کالم masoodabdali.blogspot.com اور ٹویٹر Masood@MasoodAbdali پر بھی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ ہماری ویب سائٹ www.masoodabdali.com پر تشریف لائیں۔

بلوچستان

جلال نورزئی



# وفاقی منصوبوں میں بلوچستان کا حصہ

## وزیرِاعلیٰ جام کمال کا "مؤدبانہ" احتجاج

بلوچستان کی مخلوط حکومت کئی مسائل میں گھری ہوئی ہے۔ اسے وفاق کے ستم کا بھی سامنا ہے۔ کسی اور جماعت کی حکومت ہوتی تو یقیناً وفاق کے ساتھ سندھ حکومت کی مانند مناقشہ ہوتا۔ حالیہ وفاقی بجٹ (12 جون 2020ء) سے قبل وزیراعلیٰ جام کمال خان نے اپنی دانست میں وفاقی پی ایس ڈی پی میں بلوچستان کے منصوبے ترجیحی بنیادوں پر ڈلوانے کی کوششیں کیں۔ وفاق کا بلوچستان سے سلوک، اور صوبے کی ضروریات، مشکلات اور مسائل کو لائقِ اعتناء نہ سمجھنے کی روش و رویّے کو دیکھتے ہوئے جام کمال نے مؤدبانہ احتجاج کیا۔ انہوں نے مشیر خزانہ حفیظ شیخ کی صدارت میں ہونے والے سالانہ منصوبہ بندی کمیشن کے اجلاس سے واک آؤٹ کیا۔ انہوں نے وفاقی حکومت کے نمائندوں سے متعدد ملاقاتیں کیں۔ وزیراعظم کے مشیر برائے اطلاعات لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ عاصم سلیم باجوہ سے بھی بالمشافہ ملے۔ تاہم بجٹ اور معیشت جاننے والے کہتے ہیں کہ اس وفاقی بجٹ میں بلوچستان کے منصوبوں کو کماحقہٗ جگہ نہیں مل سکی ہے، اور اس طرح صوبائی حکومت کو خفت اٹھانی پڑی ہے۔ چناں چہ اس دوران اخبارات میں خبر لگوائی گئی کہ وزیراعلیٰ کے احتجاج پر وفاقی حکومت نے بلوچستان کے لیے 56 ارب روپے کے وفاقی منصوبوں کی منظوری دے دی۔ بہرحال حزبِ اختلاف اور صوبے کی بڑی سیاسی جماعتوں نے وفاق کا طرزِعمل اس بار بھی مایوس کن اور امتیازی قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق وفاقی پی ایس ڈی پی میں بلوچستان کے منصوبے خاطر میں نہ لائے گئے۔ باتوں کی حد تک سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ بلوچستان جغرافیائی اہمیت کا حامل صوبہ ہے، اور اس کے معدنی وسائل ملک کی معیشت کے لیے جسم میں روح کی مانند ہیں، مگر عملاً صوبے کو باج گزار کی حیثیت دے رکھی ہے، اس کے وسائل ہڑپ کیے جاتے ہیں، مگر اضافی نوازشات تو کیا، صوبے کو جائز حق سے بھی محروم رکھا گیا ہے۔

دل کی بات مقتدرہ نوازوں کی زبان پر بھی آ ہی جاتی ہے، جیسے 10 جون 2020ء کو وزیراعلیٰ جام کمال خان نے بھی اس جانب اشارہ کیا۔ وزیراعلیٰ نے اپنی ایک ٹویٹ میں وہی کچھ کہا جو دوسری جماعتیں عشروں سے کہتی چلی آ رہی ہیں۔ اس روز جام کمال خان وزیراعظم عمران خان کی صدارت میں ہونے والے قومی اقتصادی کونسل کے ویڈیو لنک اجلاس میں شریک تھے۔ جام کمال نے اجلاس پر واضح کیا کہ "وفاقی سطح پر بلوچستان کے ترقیاتی معاملات کو آسان نہ لیا جائے۔ بلوچستان پہلے ہی وفاقی منصوبوں میں نظرانداز رہا ہے"۔ جام کمال تسلیم کرچکے ہیں کہ بلوچستان کی محرومیوں کی ایک اہم وجہ نامناسب اور ناکافی ترقیاتی سرمایہ کاری ہے۔ ترقیاتی اسکیموں پر توجہ نہیں دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچستان کا بڑا حصہ آج بھی غیر ترقیاتی یافتہ ہے۔ گویا وزیراعلیٰ جام کمال بھی موجود معروضی حقائق زبان پر لانے پر مجبور ہوئے۔

درحقیقت وفاق کے اس امتیازی سلوک و برتاؤ نے بلوچستان کے اندر سخت گیر و متشدد سیاسی رویوں کو جنم دیا ہے۔ شورشیں جنم لے چکی ہیں۔ اس وقت بھی ریاست کو تشدد پر مبنی سیاسی رویوں کا سامنا ہے۔ ریاست اور اسی طرح بلوچستان کا دو عشروں سے برابر نقصان ہورہا ہے۔ لہٰذا یہ ذمے داری بلوچستان عوامی پارٹی جیسی جماعتوں پر بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ وفاق سے نرمی اور تابع داری کے تعلق کے بجائے صوبے کے آئینی حقوق پر کسی قسم کا سمجھوتا نہ کریں۔ اس ضمن میں اسمبلی کے اندر حزبِ اختلاف اور صوبے کی دوسری جماعتوں کا تعاون حاصل کیا جاسکتا ہے، جہاں حکومت اور حزبِ اختلاف کے درمیان برابر دوریاں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔ حزبِ اختلاف حکومت کے ساتھ متصادم ہے، ان کا احتجاج اب سڑکوں پر ہورہا ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ کم از کم وفاق کے آگے صوبے کی مخلوط حکومت، حزبِ اختلاف اور دوسری سیاسی جماعتوں کو ایک پیج پر آنا چاہیے۔ اس ضمن میں زیادہ کردار جام کمال کی حکومت کا ہے۔ اسمبلی کے اندر قائدِ حزبِ اختلاف ملک سکندر ایڈووکیٹ ہیں۔ وہ سنجیدہ، معاملہ فہم اور اچھی شہرت کے حامل سیاست دان ہیں۔ گویا ان کے ذریعے ایک تو افہام و تفہیم کا ماحول بنایا جاسکتا ہے، دوئم وفاق پر صوبے کے آئینی حقوق کے حصول کے لیے مل کر دباؤ ڈالا جاسکتا ہے۔ سرِدست صوبائی حکومت اپنا جائزہ لے کہ آیا وہ وفاق سے صوبے کا مفاد تسلیم کرانے میں آزاد و یکسو ہے؟ یوں یقیناً حزبِ اختلاف بھی دو رائے کا شکار نہ ہوگی۔

بلوچستان کے اندر کورونا وبا پھیل جانے کے بعد حکومت کا کنٹرول رفتہ رفتہ ختم ہورہا ہے، بلکہ فی الواقع صوبائی حکومت اور سرکاری مشینری محض اجلاسوں اور اعلانات تک محدود ہوکر رہ گئی ہیں، جس کی وجہ سے کوئی فیصلہ اور پالیسی لاگو نہیں کرسکی ہیں۔ اموات کی شرح میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔ خود صوبائی حکومت کا محکمہ صحت کہہ چکا ہے کہ اگست تک صوبے کی سو فیصد آبادی کورونا مرض میں مبتلا ہوجائے گی۔ حالت یہ ہے کہ سرکاری دولت بے دریغ خرچ ہورہی ہے جبکہ نتیجہ صفر ہے۔ محض دعووں اور اعلیٰ سطح کے اجلاسوں سے درپیش چیلنج سے نمٹنا ممکن ہوتا تو صوبہ کب کا اس وبا کے خلاف بند باندھ چکا ہوتا۔ لہٰذا حکومت کا اپنی عمل داری یقینی بنانا ناگزیر ہوچکا ہے۔

●●

میاں منیر احمد
munir.media@gmail.com

رپورٹ



# تیل کی قلت۔۔۔ ذمہ دار کون؟

ملک میں تیل کے نرخوں میں کمی کیا ہوئی، ملک بھر میں تیل کی قلت ہی پیدا ہوگئی۔ پیٹرول کے کاروبار سے وابستہ افراد کی رائے ہے کہ یہ بحران اس لیے پیدا ہوا کہ حکومت نے لاک ڈاؤن کے باعث سُستی دکھائی کہ ملک بھر میں تو لاک ڈاؤن ہے، ٹرانسپورٹ چل نہیں رہی، جہاز، ٹرینیں تک بند ہیں، لہٰذا تیل منگوانے کا فیصلہ نہیں کیا۔ ملک میں تیل کی مجموعی سالانہ طلب تقریباً 2 کروڑ ٹن ہے، ملکی ٹرانسپورٹ کے کاروبار کا انحصار اسی پر ہے۔ 75 فیصد تیل ٹرانسپورٹ کا شعبہ استعمال کرتا ہے۔ زراعت، صنعت، اور بجلی پیدا کرنے والے کارخانوں کا نمبر بعد میں آتا ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق زراعت کے شعبے میں ایک فیصد تیل استعمال ہوتا ہے، صنعتیں تقریباً 7 فیصد استعمال کرتی ہیں، بجلی کی پیداوار میں 14 فیصد اور دیگر شعبوں میں تیل کی کھپت تقریباً 2 فیصد ہوتی ہے۔ ملک میں پیٹرول کی کھپت 39 فیصد، ڈیزل کی 37 فیصد، فرنس آئل کی 18 فیصد، طیاروں کے ایندھن جے پی ون کی 4 فیصد، مٹی کے تیل، لائٹ اسپیڈ ڈیزل اور ایچ او بی سی کی کھپت ایک فی صد رہتی ہے۔ ملک میں 90 کے قریب آئل مارکیٹنگ کمپنیاں اور ریفائنریاں موجود ہیں۔ مارکیٹنگ کمپنیوں میں پاکستان اسٹیٹ آئل 37 لاکھ ٹن، ہیسکول 92 ہزار ٹن اور گیس اینڈ آئل (جی او) 88 ہزار ٹن ایندھن فروخت کرتی ہیں، اور دیگر کمپنیاں 13 لاکھ ٹن ایندھن بیچتی ہیں۔ پاکستان میں 78 لاکھ ٹن ایندھن درآمد ہوتا ہے، جبکہ 68 لاکھ ٹن تیل مقامی ریفائنریاں فراہم کرتی ہیں۔ ان میں پارکو 23 لاکھ 60 ہزار ٹن، بائیکو 11 لاکھ 80 ہزار ٹن، اے آر ایل 11 لاکھ 50 ہزار ٹن، نیشنل ریفائنری 10 لاکھ ٹن، پی آر ایل 8 لاکھ 10 ہزار ٹن پیٹرو کیمیکلز کی صفائی کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

بحران اس لیے پیدا ہوا کہ وزارتِ توانائی نے پیٹرولیم کی درآمد پر پابندی عائد کی اور پہلے سے دیے گئے آرڈر بھی منسوخ کردیے، جس سے ملک میں پیٹرولیم کی سپلائی متاثر ہوئی۔ اس کے علاوہ جس وقت درآمد پر پابندی عائد کی گئی اُس وقت عالمی منڈی میں پیٹرولیم کی قیمت تاریخ کی کم ترین سطح 10 ڈالر یا اس کے آس پاس تھی، اس لیے سستا پیٹرول خریدنے کے بجائے مقامی ریفائنریوں سے خریداری کو یقینی بنایا گیا۔ کورونا کی وجہ سے لاک ڈاؤن ہوا جس کے باعث ایندھن کی طلب اچانک بہت ہی کم ہوگئی جس کی وجہ سے آئل مارکیٹنگ کمپنیوں کے کیش فلو پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔ عید کے قریب اچانک لاک ڈاؤن میں نرمی نے نقل و حرکت میں اضافہ کردیا، یوں ایندھن کی طلب بڑھ گئی۔ اب جو ایندھن لاک ڈاؤن میں 4 دن تک کے لیے کافی تھا، وہ ایک دن میں ہی فروخت ہوگیا، اور یوں قلت سنگین صورت اختیار کرگئی۔ لیکن یہ سب اچانک نہیں ہوا، بلکہ منصوبہ بندی معلوم ہوتی ہے کہ اب وزارتِ توانائی مافیا کے ساتھ مل کر پیٹرولیم کی قیمت مرکزی کنٹرول سے باہر نکال رہی ہے، اور اب قیمت کا تعین ڈی ریگولیٹ کردیا جائے گا۔ حکومت اپنی ریگولیٹری اور انتظامی صلاحیت کو بڑھائے بغیر پیٹرولیم کی قیمت کا تعین ڈی ریگولیٹ کرے گی تو اس کے انتہائی منفی نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ مافیا حکومت سے یہ فیصلہ کرانے میں کامیاب ہوجائے گا، کیونکہ تحریک انصاف کے لیے سرمایہ کاری کرنے والی لابیاں بہت متحرک ہیں اور وزارتِ توانائی ان کی مٹھی میں ہے۔ اس وقت پیٹرولیم مصنوعات کی قیمت کا تعین پی ایس او کی درآمدی قیمت کے حساب سے کیا جاتا ہے۔ ڈی ریگولیٹ ہونے کے بعد گزشتہ ماہ کی اوسط قیمت پر ملک بھر میں ڈیزل اور پیٹرول فروخت کیا جائے گا۔ حکومت ان لینڈ فریٹ ایکولائزیشن مارجن کا طریقہ کار ختم کررہی ہے جس کی وجہ سے ملک بھر میں پیٹرول کی قیمت یکساں رکھی جاتی ہے۔ نیا طریقہ کار نافذ ہوا تو بندرگاہ اور ریفائنریز کے قریب رہنے والے صارفین کو سستا پیٹرول ملے گا، جبکہ ان تنصیبات سے دُور رہنے والوں کو مہنگا خریدنا پڑے گا۔ یوں ایک ہی شہر میں مختلف کمپنیوں کے پمپس پر پیٹرول کی قیمت مختلف ہوگی اور قیمتوں میں ایک سے 5 روپے تک کا فرق ہوسکتا ہے۔

ملک میں پیٹرول کی مارکیٹ ریگولیٹ کرنے کے لیے دو ادارے ہیں، پہلا ادارہ اوگرا ہے جو مارکیٹنگ کمپنیوں اور ریفائنریز کو لائسنس فراہم کرتا ہے اور ریفائنریز لائسنس کی شرائط کے مطابق کام کو مانیٹر کرتا ہے۔ وزارتِ توانائی میں ڈائریکٹر جنرل آئل ہے جو پیٹرول کی دستیابی اور درآمد سے متعلق فیصلہ سازی کرتا ہے۔ مسلم لیگ (ن) کے دور میں اوگرا نے تمام آئل مارکیٹنگ کمپنیوں کو پابند بنا رکھا تھا کہ وہ کم از کم 21 دن کا اسٹاک محفوظ رکھیں۔ اسٹاک میں کمی کی صورت میں کمپنیوں پر جرمانے کے علاوہ انہیں لائسنس منسوخی کی سزا دی جاتی تھی۔ ہر مارکیٹنگ کمپنی کو ہر پمپ کے لیے 40 ٹن ایندھن ذخیرہ کرنا لازمی ہے۔ اگر ملک میں 8 ہزار 567 پمپ ہیں تو ہر وقت 3 لاکھ 42 ہزار 680 ٹن پیٹرول موجود ہونا چاہیے۔

31 مئی کو حکومت نے تمام پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں میں کمی کا اعلان کیا، تاہم پیٹرولیم پر ٹیکس اور لیوی میں اضافہ کردیا۔ پیٹرول کی فی لیٹر قیمت میں 7 روپے 6 پیسے کمی کی گئی، پیٹرول کی ایکس ڈپو قیمت 74 روپے 52 پیسے کی گئی، لیکن پیٹرولیم ڈیولپمنٹ لیوی کو بڑھا کر 26 فیصد کردیا گیا، یوں حکومت نے ساڑھے 6 ارب روپے کمالیے۔ پیٹرولیم لیوی کے نفاذ سے قیمت 23 روپے 76 پیسے سے بڑھ کر 30 روپے فی لیٹر ہوگئی۔ جب پیٹرولیم کی قلت پیدا ہوئی تو پیٹرولیم ڈویژن نے کمپنیوں کو ایندھن کی راشننگ کی ہدایت کردی۔ کمپنیوں کو کہا گیا کہ موٹر سائیکل پر 500 اور گاڑی کے لیے 1000 روپے یومیہ خریداری کی حد مقرر کی جائے۔ جب یہ فیصلہ ہوا تو اُس وقت پنجاب میں صرف 3 سے 4 دن کے استعمال کے لیے پیٹرول کے ذخائر رہ گئے تھے، سندھ میں 7 روز کے لیے پیٹرول اور 16 روز کے لیے ڈیزل کے ذخائر موجود تھے، خیبر پختون خوا میں 4 دن، بلوچستان میں 7 دن، آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان میں 6 دن کا اسٹاک تھا۔ تب وفاقی وزیر برائے توانائی عمر ایوب نے الزام عائد کیا کہ کچھ آئل مارکیٹنگ کمپنیوں اور ریٹیلرز نے پیٹرول اور ڈیزل کی مصنوعی قلت پیدا کی ہے۔ انہوں نے مارکیٹنگ کمپنیوں کے لائسنس منسوخ کرنے کی دھمکی بھی دی۔ وزارتِ توانائی 25 مارچ کو ایک سرکلر جاری کرچکی تھی کہ آئل مارکیٹنگ کمپنیوں کے پاس مناسب مقدار میں ذخیرہ موجود ہے، لہٰذا آئل مارکیٹنگ کمپنیاں اپریل 2020ء اور آئندہ دنوں کے لیے اپنے ایندھن درآمدی معاہدے منسوخ کردیں۔ اس فیصلے نے ملک میں تیل کے بحران کی بنیاد رکھی۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے پیٹرول کی فروخت 25 فیصد رہ گئی تھی، یوں آئل کمپنیاں خسارے میں چلی گئیں۔ روپے کی قدر میں کمی سے بھی نقصان ہوا، کیونکہ عالمی منڈی سے مہنگے ڈالر میں ایندھن کی خریداری کرنے کے بعد انہیں سستا ایندھن فروخت کرنا پڑا۔ ہر کمپنی کو پیٹرول کا انتظام کرنے کی ہدایت دی گئی تھی، مگر بحران تو سر اٹھا چکا تھا، تب وزارتِ توانائی نے ڈائریکٹر جنرل پیٹرولیم ڈاکٹر شفیع الرحمٰن کی سربراہی میں کمیٹی تشکیل دی جس میں اوگرا، وفاقی تحقیقاتی ادارے، ضلعی انتظامیہ، ہائیڈروکاربن ڈیولپمنٹ

(باقی صفحہ 41 پر)

سلمان عابد

salmanabidpk@gmail.com


تجزیہ




## نیب اپنی ساکھ کھو چکا ہے

پاکستان کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہاں احتساب کے عمل کو سیاسی جماعتوں اور فوجی حکومتوں نے سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں احتساب کا نظام اپنی شفافیت اور ساکھ کو قائم کرنے میں بری طرح ناکام ثابت ہوا۔ فوجی اور سیاسی حکمرانی...... احتساب کے حوالے سے دونوں کا ریکارڈ اپنے اندر کئی طرح کے سیاسی تضادات رکھتا ہے، اور لگتا ہے کہ ان طاقت ور حکمرانوں کا مسئلہ احتساب نہیں بلکہ احتساب کو بنیاد بنا کر اپنی حکمرانی کے نظام کو مضبوط بنانا تھا۔

اس وقت بھی ملک میں احتساب کی جنگ جاری ہے۔ نیب کا دعویٰ ہے کہ وہ بغیر کسی تفریق کے ملک میں صاف، شفاف احتساب کے عمل کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا جائے گا۔ لیکن عملی صورتِ حال یہ ہے کہ نیب کی ساکھ پر بھی سوالات اٹھ رہے ہیں اور لوگوں کو لگتا ہے کہ موجودہ نیب بھی احتساب کے عمل میں کوئی کلیدی کردار ادا نہیں کرسکے گا۔ عمران خان کی حکومت کے ایجنڈے میں ایک بنیادی نکتہ احتساب کا عمل تھا۔ وزیر اعظم عمران خان کے بقول وہ احتساب کے معاملے میں کوئی سمجھوتا نہیں کریں گے، لیکن عمران خان کی حکومت بھی احتساب کے عمل میں وہ نتائج نہیں دے سکی جن کا وہ دعویٰ کیا کرتی ہے۔

اس وقت نیب کے حوالے سے پانچ بڑے الزامات سیاسی حلقوں میں زیرِ بحث ہیں:

(1) حکومت نیب کو اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف بطور سیاسی انجینئرنگ استعمال کررہی ہے۔

(2) حکومت، نیب، عدلیہ اور اسٹیبلشمنٹ میں باہمی گٹھ جوڑ ہے۔

(3) عملی طور پر حکومت میں موجود لوگ جو نیب کو درکار ہیں یا احتساب کے دائرۂ کار میں آتے ہیں اُن کو نہیں پکڑا جارہا، اور سارا زور حکومتی مخالفین کو جکڑنے پر ہی ہے۔

(4) نیب کے تفتیشی نظام پر بھی کڑی تنقید کی جارہی ہے، اور کہا جارہا ہے کہ کئی کئی ماہ تک لوگوں کو زیرِ حراست رکھنا اور عدالتوں میں جرائم کے شواہد پیش نہ کرنا، اور عدالتوں سے ان کی ضمانتوں کا ہونا خود نیب کی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔

(5) خود ہماری عدالتیں بھی نیب کی کارروائیوں پر کڑی تنقید کرچکی ہیں، اور ان کے بقول نیب بہت سے معاملات میں اپنی حدود سے تجاوز کرتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان میں کرپشن اور اقربا پروری سمیت ریاستی وسائل کی لوٹ مار کی کہانی اپنے اندر کئی سیاسی حقائق رکھتی ہے۔ کرپشن کسی ایک فریق نے نہیں کی، بلکہ طاقت کے مراکز میں موجود تمام فریق کسی نہ کسی شکل میں کرپشن کی سیاست کا شکار رہے ہیں۔



آج بھی کرپشن کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے اور حکومت اس کے خلاف کوئی مؤثر بند نہیں باندھ سکی، اور اس کی وجہ حکومتی اداروں کا کرپٹ مافیاز کے ساتھ باہمی گٹھ جوڑ ہے جو احتساب کے شفاف نظام میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

اگرچہ جو بھی سیاسی یا دیگر فریقین نیب کو مختلف مقدمات میں مطلوب ہیں یا وہ نیب کی تحویل میں ہیں، کہتے ہیں کہ انہوں نے کوئی کرپشن نہیں کی۔ سب ہی اسے حکومت کی انتقامی کارروائی سمجھتے ہیں، اور ان میں سے بیشتر جمہوریت اور سیاست کو ڈھال بناکر خود کو ضمیر کے قیدی کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر واقعی ان لوگوں نے کوئی کرپشن نہیں کی تو سالانہ بنیادوں پر ہونے والی کرپشن کی اس کہانی کا ذمہ دار کون ہے؟ اور کون لوگ کرپشن کرنے کے ذمہ دار ہیں؟ اسی طرح یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ ماضی یا حال کی جو بھی سیاسی اور فوجی حکومتیں کیوں ایک منصفانہ، شفاف اور خودمختار احتساب کا نظام قائم نہیں کرسکیں؟ کیا وجہ ہے کہ آج نیب پر سب سے زیادہ تنقید کرنے والی دونوں جماعتیں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) اپنے پانچ پانچ برس کے اقتدار کے باوجود نہ تو نیب کو ختم کرسکیں اور نہ ہی احتساب کا کوئی متبادل نظام قائم کرسکیں، جس سے ان کی سیاسی بدنیتی ظاہر ہوتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ہماری سیاسی قیادتوں نے عملاً کرپشن کے خاتمے کے بجائے اس پر سیاسی سمجھوتے کیے، اور سیاست و جمہوریت کو کرپشن کے حق میں استعمال کرکے ہماری قومی سیاست کو کرپٹ کرنے میں اپنا کلیدی کردار ادا کیا۔

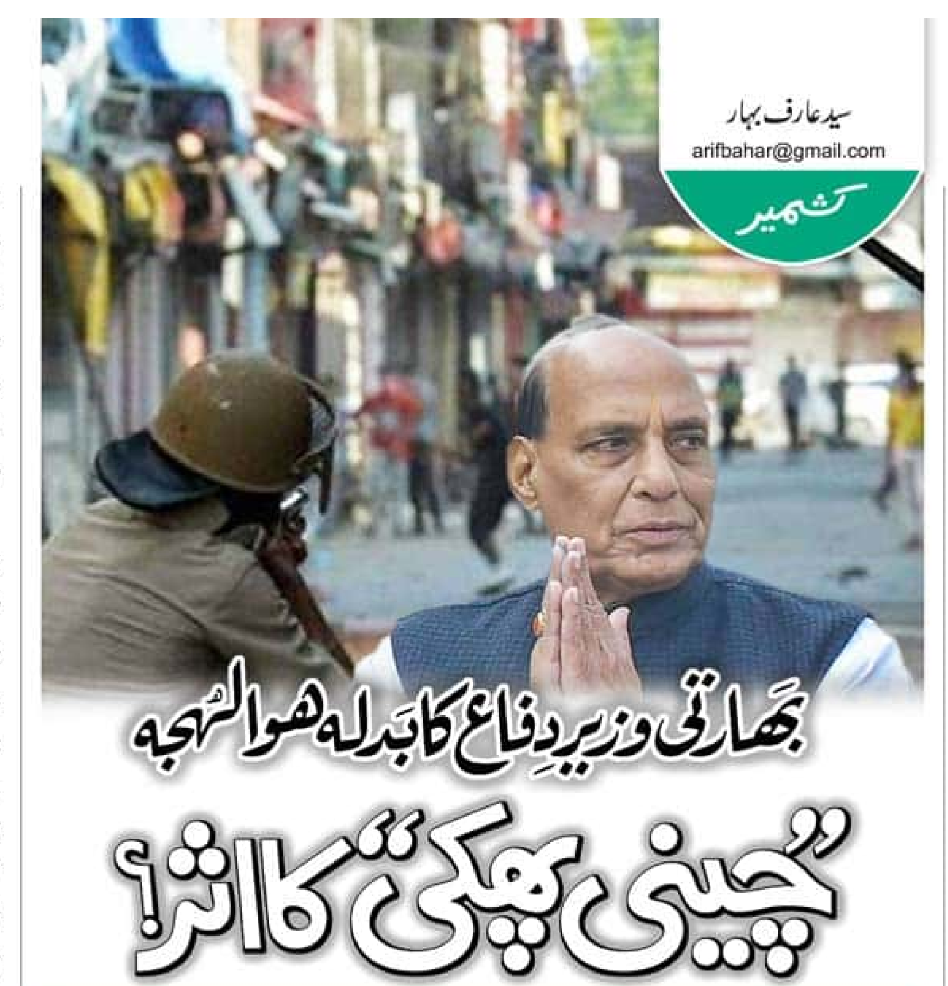
اس ملک میں کرپشن کے خاتمے احتساب نہ ہونے کی وجہ محض کوئی ایک ادارہ نہیں، بلکہ مجموعی طور پر تمام سیاسی، انتظامی، قانونی، ظاہری اور پس پردہ طاقتیں اس کی ذمہ دار ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ احتساب کے عمل میں ایک طبقاتی طرز کی سوچ غالب ہے۔ طاقت ور اور کمزور کے درمیان ہمارا پورا احتساب کا نظام دہرا معیار رکھتا ہے، اور اس تناظر میں تضادات اور دہرے معیار کی جو جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم احتساب کے عمل میں کہاں کھڑے ہیں۔ عمومی طور پر کہا جاتا ہے کہ وائٹ کالر کرائم کو پکڑنا آسان نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے، لیکن حکمرانی کے نظام کی خوبی ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ ایسی کارروائیوں کو یقینی بناتا ہے جس سے وائٹ کالر کرائم کے خلاف شکنجہ زیادہ سے زیادہ سخت کیا جاتا ہے۔ لیکن لگتا یہ ہے کہ حکومت، بیوروکریسی، انصاف کے اداروں سمیت دیگر اداروں میں بھی ایسے کئی لوگ موجود ہیں جو ایسی قانون سازی، پالیسی یا اس پر عمل درآمد کے خلاف کام کرتے ہیں جو کڑے احتساب کو یقینی بناسکے۔

دراصل احتساب کا جو بھی نظام ہو، اُس کی سیاسی و قانونی ساکھ اسی صورت میں قائم ہوتی ہے جب وہ نہ صرف بے لاگ ہو، بلکہ یہ بے لاگ یا شفاف عمل سب کو واضح طور پر نظر بھی آنا


(باقی صفحہ 41 پر)

سید عارف بہار
arifbahar@gmail.com

کشمیر



# بھارتی وزیرِ دفاع کا بدلا ہوا لہجہ

# "چینی پھکی" کا اثر؟

## پانچ اگست کے بھارتی فیصلے نے چین اور پاکستان کو مشترکہ چیلنج کے ایک نئے رشتے میں جوڑ دیا ہے

5 اگست 2019ء کے یک طرفہ اور متنازع فیصلے کے بعد بھارتی حکمران پاکستان اور کشمیر کے حوالے سے ہوا کے ایک گھوڑے پر سوار تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ بھارت اب ہر رکاوٹ کو روندکر اپنے متعین کردہ راستے پر چلتا چلا جائے گا۔ چین کے ایک تھنک ٹینک کی جاری کردہ رپورٹ کے مطابق اس پُراعتمادی کی دو وجوہات تھیں۔ اوّل یہ کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو انتخابات میں محیرالعقول کامیابی حاصل ہوئی تھی، اور اس کامیابی نے ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو ماؤف کرڈالا تھا۔ دوئم، چین کے مقابلے کے لیے امریکہ اور بعض مغربی ملکوں کی طرف سے بھارت کی غیر ضروری ناز برداری، جس کی وجہ سے وہ کشمیر میں بھارتی مظالم سے صرفِ نظر کرنے پر مجبور تھے۔ یہ رپورٹ چین کے تھنک ٹینک "چائنا انسٹی ٹیوٹ آف کنٹمپریری انٹرنیشنل ریلیشنز" میں ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کے ڈپٹی ڈائریکٹر مسٹر وانگ شدا نے تیار کی تھی، جس میں پانچ اگست کے فیصلے کو چین اور پاکستان کی سلامتی کے لیے ایک چیلنج قرار دیا گیا تھا۔ یہ رپورٹ نہ صرف چین کے مختلف اخبارات میں شائع ہوئی بلکہ اسلام آباد میں چینی سفارت خانے کے پریس اتاشی نے بھی اس کا اجرا کیا، جس سے یہ تاثر گہرا ہوا کہ پانچ اگست کے بھارتی فیصلے نے چین اور پاکستان کو مشترکہ چیلنج کے ایک نئے رشتے میں جوڑ دیا ہے۔

اس رپورٹ کے اسلام آباد سے اس انداز سے اجراء اور تشہیر کو بھارتی میڈیا نے درست سیاق وسباق کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی۔ گویا کہ کشمیر میں بھارت نے صرف پاکستان کو ہی نہیں چین کو بھی للکارا تھا۔ چین کی طرف سے بھارت کو جو پیغامات مسلسل دیے گئے، لداخ میں ہونے والی پیش قدمی ان میں سب سے اہم اور عملی پیغام تھا۔ اس سے پہلے چین نے ہر ممکن حد تک عالمی ایوانوں میں اپنی شکایات پیش کی تھیں، مگر مغربی ملکوں بالخصوص امریکہ کی بھارت نوازی نے سلامتی کونسل میں اُٹھنے والی اس آواز کو صدا بہ صحرا بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، جس کے بعد لداخ جیسا انتہائی قدم اُٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

یوں لگتا ہے کہ چین کا پاؤں بھارت کے کسی نازک مقام پر پڑ گیا ہے۔ اب چین اور بھارت کے درمیان اس مسئلے کا حل پسِ پردہ سفارت کاری کے ذریعے نکالا جارہا ہے، اور کشمیر اس سفارت کاری کا حصہ ہے۔ اس ساری صورتِ حال کے تناظر میں بھارت کے اخبار "دی ہندو" میں کشمیری صحافی عاشق پیرزادہ نے بھارتی وزیر دفاع راج ناتھ سنگھ کے ایک وڈیو خطاب کی رپورٹنگ کی ہے۔ عاشق پیرزادہ اُن کشمیری صحافیوں میں شامل ہیں جن پر بھارتی حکومت نے بغاوت کا مقدمہ قائم کرنے کی کوشش کی تھی، مگر دنیا بھر کے صحافیوں کے احتجاج پر بھارتی فوج نے انہیں تھانوں اور چھاؤنیوں کے چکر لگواکر چھوڑ دیا۔ دی ہندو کی رپورٹ کے مطابق راج ناتھ سنگھ نے مقبوضہ کشمیر میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے کارکنوں سے خطاب کیا۔ راج ناتھ سنگھ کا کہنا تھا کہ کشمیر میں تعمیر وترقی ہماری ترجیح ہے، اب اگلے پانچ سال میں ہم کشمیر میں ایسی بے مثال تعمیر وترقی کریں گے جسے دیکھ کر آزاد کشمیر کے عوام پاکستان کے بجائے بھارت کے ساتھ رہنے کے لیے آواز بلند کریں گے۔ راج ناتھ سنگھ نے بھارت کے سرکاری ٹی وی اور ریڈیو پر مظفرآباد اور گلگت کے موسم کا احوال بتانے کے حوالے سے کہا کہ موسم کا احوال جان کر اسلام آباد لازمی طور پر اپنا ذہن بدلنے پر مجبور ہوگا۔ یہ پاکستان کے کچھ شرارتی اقدامات کو روکنے کا انداز ہے۔

راج ناتھ سنگھ کے اس بیان کو اسلام آباد میں دفتر خارجہ کی ترجمان عائشہ فاروقی نے یہ کہہ کر مسترد کیا کہ یہ مقبوضہ کشمیر کی صورتِ حال سے توجہ ہٹانے کی کوشش ہے۔ دفترِ خارجہ کے پاس ہر بھارتی بیان کے جواب میں ایک ہی بیان کی فوٹو اسٹیٹ موجود ہے جسے بوقتِ ضرورت جاری کیا جانا اب رسم اور روایت ہے۔ راج ناتھ سنگھ کے بیان کا گہرائی سے تجزیہ کیا جائے تو صاف لگتا ہے کہ لداخ میں "چینی پھکی" اپنا اثر دکھا گئی ہے جس کے بعد بھارت ہوا کے گھوڑے سے زمین پر اُتر آیا ہے۔ کل تک بھارت آزاد کشمیر اور گلگت پر قبضے کو دنوں اور مہینوں کا معاملہ قرار دے رہا تھا۔ بھارت کی طرف سے یہ تاثر دیا جارہا تھا کہ اگلے کسی بھی لمحے بھارتی فوج آزاد کشمیر کی طرف پیش قدمی شروع کردے گی۔ راج ناتھ سنگھ کے بیان میں اس سارے موقف سے واضح اور نمایاں "یوٹرن" لیا گیا ہے۔ اب طاقت کے استعمال اور آزاد کشمیر پر قبضے کے بجائے تعمیر وترقی کے ذریعے، اور آزاد کشمیر کے عوام کو رضاکارانہ طور پر بھارت کی طرف متوجہ کرنے کی بات کی گئی ہے۔ اس سارے افسانے میں آزاد کشمیر کی بات تو کی گئی مگر گلگت بلتستان کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا گیا۔ گلگت بلتستان کی سرحد براہِ راست چین سے ملتی ہے۔ موسم کے احوال کو بھی آزاد کشمیر پر قبضے کے جارحانہ انداز کے بجائے اب ہلکا پھلکا مزاحیہ رنگ دیا گیا ہے، یعنی یہ کہ بھارتی ٹی وی پر موسم کا احوال دیکھ کر پاکستان اپنا رویہ بدلنے پر مجبور ہوگا۔ راج ناتھ سنگھ کے اس طرزِ تخاطب، بولی اور بدن بولی سے صاف اندازہ ہورہا ہے کہ چینی نسخے کا جادو چل گیا ہے، اور بھارت اپنے مقابل چین جیسی بڑی طاقت دیکھ کر انانیت سے بھرپور جارحانہ رویّے میں واضح تبدیلی لارہا ہے۔ راج ناتھ سنگھ کے خیالات سے نخوت اور تکبر کے بجائے شکست خوردگی اور درماندگی ٹپک رہی ہے۔

خود بھارت کے اندر راج ناتھ سنگھ کے اس انداز کو طنزیہ انداز میں ہدفِ تنقید بنایا جارہا ہے۔ ایک صحافی اور براڈ کاسٹر نے ٹویٹ کیا ہے کہ "بھارت کشمیر میں ایسی تعمیر وترقی کرے کہ چین کے عوام بھی اسے دیکھ کر بھارت کے ساتھ ملنے کی بات کرنے پر مجبور ہوں"۔ ایک شخص کا کہنا تھا کہ چین ہماری زمین لے اُڑا، نیپال نے بھارتی زمین پر دعوے پر مبنی نقشہ جاری کردیا اور مودی پاکستان کا روایتی راگ الاپ رہے ہیں۔ یعنی پانچ سال تک تو

(باقی صفحہ 41 پر)




اے اے سید

تصاویر: شہزاد


انٹرویو

# تبدیلی کے لیے کثرتِ تعداد شرط نہیں ہے

## ہم نے دین کو ظواہر میں تبدیل کر دیا ہے

## اسکرین کوئی بھی ہو انسانی ذہن پر منشیاتی اثر پیدا کرتی ہے

## پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد سے مکالمہ (پہلا حصہ)

**فرائیڈے اسپیشل:** اپنی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیں۔ جہاں آپ پیدا ہوئے وہاں کا سماجی اور معاشرتی ماحول کیسا تھا؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** میری پیدائش ایک علمی اور ادبی گھرانے میں ہوئی، میرے والد صاحب مرحوم اور والدہ دونوں کا ادبی ذوق بہت ستھرا ہوا تھا، اس بنا پر بچپن سے مجھے یہ موقع ملا کہ میں کلاسیکل شعر و ادب کا مطالعہ کروں۔ گھر کے اندر ہونے والی گفتگو بھی زبان اور موضوعات کے حوالے سے عام گھروں سے مختلف اور علمی موضوعات پر مشتمل ہوتی، اس لیے بچپن ہی سے علمی تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے اور تدریس سے وابستگی کے بعد اس ذوق وشوق میں مزید اضافہ ہوا اور یونیورسٹی میں خاص طور پر علمی سرگرمیوں میں شامل رہا اور بہت سے صاحبِ علم وفن حضرات کو یونیورسٹی میں ان سرگرمیوں میں مدعو کیا، ان کے خیالات جاننے کا موقع ملا اور ساتھ ساتھ یونیورسٹی کے معروف اساتذہ سے بھی تبادلہ خیال کا موقع ملا، اور یہ اُس وقت کی بات ہے جب ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب وائس چانسلر تھے اور میجر آفتاب صاحب کیمپس میں معروف وسرگرم شخصیت تھے، ڈاکٹر محمود احمد شعبہ فلسفہ کے ہیڈ بھی تھے اور کچھ عرصہ ڈین بھی رہے۔ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی صاحب صدر شعبہ اسلامی تاریخ تھے وہ بھی ڈین ہوئے، وہ میرے استاد بھی تھے۔ ڈاکٹر محمود حسن خان صدر شعبہ تاریخ تھے ان کے ساتھ ہی ہمارا ڈیپارٹمنٹ تھا جو بعد میں وائس چانسلر بھی بنے۔ ڈاکٹر عزیز صاحب کا کمرہ بھی بہت قریب تھا جو بعد میں رجسٹرار بنے۔ یعنی بے شمار افراد جو یونیورسٹی کی ذمہ داریوں پر بعد میں فائز ہوئے ان سے براہِ راست ملاقات اور استفادہ کا موقع ملا۔ اس کے نتیجے میں مجھے اپنے ذہنی ارتقا میں بے انتہا مدد ملی اور یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی تعلیم سے فارغ ہوا مجھے بطور لیکچرر مقرر کر دیا گیا۔ میں چھ سال تک کراچی یونیورسٹی میں تدریس کے شعبے سے وابستہ رہا اور پھر ٹمپل یونی ورسٹی کی اسکالرشپ پر پی ایچ ڈی کرنے چلا گیا۔ ہمارے گھر کا ماحول ادبی بھی تھا اور بہت دینی بھی۔ گھر کے ماحول نے زبان اور فکر کو سنوارنے میں بنیادی کردار ادا کیا، یہ صرف اللہ تعالیٰ کا احسان تھا کہ مجھے گھر اور جامعہ دونوں نے ہر لمحہ تقویت فراہم کی۔

**فرائیڈے اسپیشل:** آپ کی شخصیت کے ارتقا اور فکر کی تشکیل میں مذکورہ عوامل کے علاوہ دیگر کون سے عوامل تھے

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد عہدِ حاضر میں ہماری علمی اور دینی روایت کے وارث اور اہم اسکالر ہیں۔ آپ کا شمار برصغیر کی اُن چند شخصیات میں ہوتا ہے جو تاریخ کے ساتھ عصرِ حاضر کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اسلامی تحریکوں کی جدوجہد پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ آپ کا تعلق دلّی ”جو اک شہر تھا عالم میں انتخاب“ کے ایک معزز علمی خانوادے سے ہے۔ ایڈمرل (سابق) ضمیر احمد مرحوم، پروفیسر خورشید احمد، اور ممتاز طارق مرحوم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ کے سب سے بڑے بھائی ضمیر احمد نے سب سے پہلے کراچی میں اسلامی جمعیت طلبہ کے کام کا آغاز کیا، اور اپنے بھائی خورشید احمد کو جمعیت میں متعارف کرایا۔ عملی زندگی میں پاکستان نیوی میں چلے گئے۔ یہ ایک معروف بات ہے کہ اگر آپ پروفیسر خورشید احمد کے بھائی نہ ہوتے تو پاک نیوی کے چیف ہوتے۔ آپ کے بھائی ممتاز طارق 20 مئی 1965ء کو قاہرہ میں پی آئی اے کی پہلی پرواز کو پیش آنے والے حادثے میں فوت ہوگئے۔

آپ کے والد نذیر احمد قریشی مرحوم کا تعلق بنیادی طور پر جالندھر سے تھا، جو دہلی کے معروف تاجر، اعلیٰ علمی، دینی، سیاسی اور سماجی شخصیات کے دوست تھے۔ نذیر احمد صاحب مولانا مودودیؒ کے بے تکلف رفقا میں سے تھے، جنھوں نے متعدد علمی اور قیمتی کتابیں مولانا مودودیؒ کو تحفے میں دیں۔

ڈاکٹر انیس احمد 22 مارچ 1944ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ میٹرک سندھ مدرسۃ الاسلام سے، اور گریجویشن سندھ مسلم کالج سے کی۔ کراچی یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران سیاسی وسماجی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ تب کراچی یونیورسٹی میں نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا طوطی بولتا تھا۔ انیس احمد نے اسلامک اسٹڈیز سوسائٹی کی سرگرمیوں کو جامعہ میں اس قدر وسعت دی کہ وہ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کے مقابلے میں متحرک باڈی کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔ 1963ء میں ایم اے پاس کیا اور یہیں شعبہ اسلامی تاریخ میں 1969ء تک پڑھایا۔

1969ء میں پنسلوانیا اسٹیٹ کی ٹمپل یونیورسٹی میں اسکالرشپ پر امریکہ چلے گئے اور پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ وہاں کچھ عرصہ بعض جامعات میں بھی پڑھایا۔ آپ اس کے علاوہ ملائشیا میں بھی تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ دعوۃ اکیڈمی اسلام آباد کا تصور پیش کرنا اور اس کو عملی جامہ پہنانا آپ کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ آپ اس اکیڈمی کے بانی ڈائریکٹر جنرل رہے ہیں۔ انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی میں مختلف کلیات کے قیام میں آپ کا کلیدی کردار تھا۔ پھر بات یہیں ختم نہیں ہوگئی، آپ نے ٹیم ورک کے ساتھ اس کو بہترین انداز میں چلا کر بھی دکھایا اور عالمی سطح پر لوہا منوایا۔ اسی کے ساتھ چین، وسطِ ایشیا، لاطینی امریکہ سمیت کئی ممالک کی کتابوں کے ترجمے کرواکر مختلف زبانوں میں ان کے متعلقہ لوگوں کی اجازت سے چھپوانا بھی آپ کی محنت، لگن اور کاوش کا نتیجہ تھا۔ آپ آج کل رفاہ یونیورسٹی اسلام آباد کے وائس چانسلر ہیں، اور صرف روایتی وائس چانسلر نہیں بلکہ آپ یونیورسٹی کے انتظامی معاملات سے لے کر طالب علموں تک سے رابطے میں رہتے ہیں۔ آپ طالب علموں کو اچھا پاکستانی اور مسلمان بنانے کے وژن اور مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی ذہنی وفکری سطح کو بلند کرنے کے لیے بھی ہر وقت پُرعزم اور عملی طور پر متحرک رہتے ہیں۔

آپ سے رفاہ یونیورسٹی اسلام آباد میں ایک تفصیلی ملاقات ہوئی۔ اس انٹرویو کے توسط سے زمانہ طالب علمی کے دوست، ملنسار اور ہمیشہ محبت اور مسکراہٹ کے ساتھ ملنے والے، کے مشاقؔ سے بھی بیس سال کے بعد ملاقات خوشگواری میں اضافے کا باعث بنی، جو جناب ڈاکٹر انیس احمد کے پرسنل سیکریٹری رفاہ یونیورسٹی ہیں۔

محبت اور شفقت کے ساتھ استقبال کرنے، دھیمے لہجے اور خوب صورت زبان میں مدلل گفتگو کرنے والے ڈاکٹر انیس احمد سے گفتگو کا سلسلہ ڈھائی گھنٹے سے زیادہ جاری رہا۔ بات چیت کا یہ دورانیہ بھی کم تھا اور بات بھی بہت ہوسکتی تھی، لیکن وقت کی کمی دامن گیر رہی۔ ڈاکٹر انیس احمد سے نظام تعلیم کی خرابیاں، ادب اور اسلامی ادب کی بحث، نظریاتی جدوجہد کا فقدان، اسبابِ قحط الرجال، مخلوط تعلیم کا جواز، موبائل، انٹرنیٹ کی دنیا، کتاب اور کاغذ کی اہمیت، جدیدیت، ٹیکنالوجی، اسلامی تحریکات، سید مودودیؒ کی تعلیمات کے دنیا پر اثرات، علمی و فکری بحران، انقلابی تحریکیں اور ان کی جدوجہد، مغربی اور اسلامی فکر کی آویزش، نائن الیون کے بعد مسلمانوں کے خلاف مغرب کا غصہ، مغربی تہذیب کے زوال کے بعد عروج کس کا، مغرب سے تعلقات کی نوعیت، سیاست اور اس کی اخلاقیات، آج کا نوجوان، اسلامی تحریکوں کی انتخابی اور جمہوری عمل کے ذریعے تبدیلی کی خواہش، ریاست مدینہ کا عملی تصور، سماج اور اخلاقی مسائل، آج کا استاد اور آج کا شاگرد سمیت دیگر موضوعات پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو کے اقتباسات نذرِ قارئین ہیں۔

...۞...۞...۞...

یا کن شخصیات کا کردار رہا؟

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد: شخصیات تو بے شمار ہیں لیکن مجھے سب سے زیادہ متاثر مولانا مودودی کی تحریرات اور شخصیت نے کیا۔ کالج اور یونی ورسٹی کی تعلیم کے دوران اردو میں ادبی اور علمی تخلیقات کو پڑھنے کا موقع ملا۔ ان میں سرسید، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، ابوالکلام آزاد، غلام رسول مہر اور ادب و شعر کی دنیا کی معروف شخصیات شامل تھیں۔ لیکن جب میں نے مولانا مودودی کی تحریرات کو پڑھنا شروع کیا تو انھیں ان سب سے مختلف پایا۔ مولانا مودودی کی تحریر میں نہ وہ شوکتِ الفاظ تھی جو مولانا ابوالکلام آزاد کا امتیاز تھا، نہ علامہ شبلی کی کلامی روایت۔ مولانا مودودی کی تحریر میں فکر کی گہرائی، الفاظ کی سادگی اور اطناب کی جگہ اختصار نے مجھے بہت متاثر کیا۔ یہ دور اختصار کا ہے، سادگی کا ہے اور جو بھی نفسِ مضمون ہے اس کی حد تک بات کرنے کا ہے۔ اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ آپ پہلے ایک بیان شروع کریں، پھر گریز کریں، پھر آپ واپس آئیں اور آخر میں جاکر آپ کوئی مقطع پیش فرمائیں بلکہ جو بات ہو وہ کم سے کم الفاظ میں ادا کردی جائے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ مولانا کے اسلوب کا یہ کمال ہے اور فکر ظاہر ہے کہ انہوں نے مختلف علوم کے گہرے مطالعہ سے اپنی فکر کو مرتب کیا اور دین کا جو تصور پیش کیا وہ بالکل ایک عملی تصور ہے کہ دین ایک زندہ کی حقیقت ہے، وہ ایک بیرونی عنصر نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد پر زندگی کا وجود ہے اور اسی چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔

فرائیڈے اسپیشل: مولانا مودودی کی علمی اور ادبی خدمات کی کیا اہمیت ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد: میرے خیال میں مولانا مودودی کا علمی کارنامہ دورِ جدید میں اسلام کی عملی تطبیق ہے۔ مغربی تہذیب اور فکر نے مسلمان دانشوروں کو بھی متاثر کیا اور انسانی تاریخ اور فکر کے ارتقائی تصور کی بنا پر یہ سمجھنے لگے کہ ساتویں صدی میں آنے والی تعلیمات پر آج کیسے عمل ہوگا۔ اس لیے یا تو ان تعلیمات پر نظرثانی کی جائے یا انھیں کچھ کتر بیونت کرکے آج کے ”ترقی یافتہ“ دور کے مطالبات کے مطابق بنایا جائے۔ مولانا مودودی نے قرآن وحدیث کے دلائل سے سرمایہ داری، اشتراکیت، الحاد اور ارتقائی تصورات کا رد عقلی اور منطقی اسلوب میں کیا اور نہ صرف علمی سطح پر بلکہ اصلاحی اور دعوتی تحریک قائم کرکے ثابت کیا کہ اس دور میں بھی اسلام ویسے ہی قابلِ عمل ہے جیسے دورِ اوّل میں تھا۔ مولانا کے ایک اصلاحی تحریک قائم کرنے کا ایک ردعمل یہ ہوا کہ جن لوگوں نے جماعت اسلامی کو محض ایک دینی یا محض ایک سیاسی تحریک سمجھا، انہوں نے مولانا کی فکر کو جماعت سے وابستہ سمجھتے ہوئے اس پر توجہ کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ لیکن اگر کسی نے ان کی تحریر کا مطالعہ کرلیا تو پھر ان کے سادہ اسلوب اور قرآنی فکر نے اسے لازماً متاثر کیا۔ میں سمجھتا ہوں مولانا کو جماعت کے فکری قائد کی جگہ ایک عالمی اسلامی مفکر، داعی اور مصلح کے طور پر مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ پوری امت مسلمہ کے اس دور کے مجدد کہے جانے کے مستحق ہیں۔ بلکہ ان شخصیات میں سے ہیں جن کو ہم کہہ سکتے ہیں

کہ قرآن کریم کی آفاقیت نے ان کی فکر میں آفاقیت پیدا کی۔ اس پہلو سے دورِ حاضر کے تین افراد قابل ذکر ہیں، ایک علامہ اقبال، دوسرے مولانا مودودی اور تیسرے علامہ محمد اسد۔ ان تینوں نے قرآن کریم سے اپنے آپ کو وابستہ کرکے وہ فکر امتِ مسلمہ کو دی جس میں قرآن کی آفاقیت پائی جاتی ہے۔ اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ جو تعصبات پیدا ہوئے ہیں کہ مولانا فلاں گروہ، فلاں جماعت کے قائد ہیں اور ہم دانشور ہیں، زیرک افراد ہیں، پڑھے لکھے افراد ہیں، روشن خیال ہیں، وقت سے آگے سوچنے والے ہیں، یہ ایک مصنوعی تفریق ہے جو ختم ہونی چاہیے۔ ان کا جو اصل مقام ہے آفاقی فکر رکھنے والے مفکر کی حیثیت سے، ایک مجتہد کی حیثیت سے، دین کی تشریح کرنے والے ایک فرد کی حیثیت سے دیکھنے کی ضرورت ہے، ان کو ان کے سیاسی کردار سے الگ کرکے دیکھنے کی ضرورت ہے، یہ کام وہی کرے گا جو غیر جانبدار ہو۔ دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ علمی غیر جانبداری عملاً مفقود ہے، کوئی کتنا ہی بڑا دعویٰ کرے کہ وہ غیر جانبدار ہے لیکن جو عصبیتیں ہیں انہوں نے علم کی صحیح فکر کو، صحیح پہچان کو زنگ آلود کردیا ہے، جب تک یہ زنگ کم نہیں ہوگا اُس وقت تک شاید وہ محدود رہے، لیکن میری نگاہ میں وہ ایک بہت ہی عظیم شخصیت کے حامل تھے اور میں نے ان کو پڑھا ہی نہیں ہے بلکہ انہیں بہت ہی قریب سے دیکھا ہے، ان کے ساتھ سفر کیا ہے، ایک عرصے تک ان کے قریب رہا ہوں، آخر وقت تک میں ان کے ساتھ رہا، ان سے ملاقاتیں رہی ہیں حتیٰ کہ ان کی نماز جنازہ بھی بفیلو، امریکہ میں ایک میں نے پڑھائی اور ایک ڈاکٹر اسرار صاحب نے پڑھائی۔ ان سے ہر لحاظ سے بہت قریبی تعلق رہا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ان کی شخصیت کو ہم نے بہت محدود کردیا ہے، اور اس کے ذمہ دار کسی حد تک وہ افراد ہیں جو اپنے آپ کو اُن کا مرید اور ماننے والا کہتے ہیں۔

**فرائیڈے اسپیشل:** مولانا سے متعلق کوئی بات، کوئی واقعہ، کوئی ایسی چیز جو آپ قابلِ ذکر سمجھتے ہوں؟

**ڈاکٹر انیس احمد:** میرے خیال میں جو چیز بڑی نمایاں ہے وہ ان کا خاکساری کا رویہ ہے۔ انہیں کبھی یہ احساس نہیں ہوا کہ وہ سید زادے ہیں، وہ ایک سلسلۂ تصوف کے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں، وہ ایک تحریک کے بانی ہیں، وہ ایک مفکر ہیں، وہ ایک مفسر ہیں۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود انہوں نے اپنے آپ کو ایک انتہائی منکسر المزاج فرد کی حیثیت سے پیش کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں وہ انانیت نہیں تھی جو علم پیدا کرتا ہے تو یہ ایک جائز تجزیہ ہوگا۔

**فرائیڈے اسپیشل:** مولانا مودودی کی فکر انقلابی فکر ہے اور اس نے پوری امت کے اندر بیداری کی لہر پیدا کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا مولانا کی فکر کی انقلابیت آج بھی جو مذہبی تنظیمیں ہیں اُن کی جدوجہد میں موجود ہے، یا پس منظر میں چلی گئی ہے؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** فکر اور اس کی عملی شکل یہ دونوں ملے ہوئے ہیں، لیکن ضروری نہیں ہے کہ ان میں ہمیشہ یکسانیت پائی جائے۔ بعض مفکرین جیسے علامہ اقبال کی فکر بڑی اعلیٰ ہے، بڑی گہری ہے، بہت مستند ہے۔ لیکن کیا علامہ اقبال کوئی تحریک پیدا کرسکے؟ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس بنا پر وہ ناکام ہوگئے؟ مولانا مودودی نے فکر بھی پیش کی، ایک تحریک بھی پیدا کی، اور اس تحریک کو ایک عملی شکل دی۔ گویا کہ وہ ایک مفکر بھی ہیں اور ایک منتظم بھی ہیں جنہوں نے افراد کے مزاج اور ضروریات کے لحاظ سے ایک اجتماعیت پیدا کی۔ یہ دو بالکل الگ چیزیں ہیں۔ ہر قائد ایسا نہیں ہوسکتا۔ جن لوگوں کو انہوں نے متاثر کیا ہو، ضروری نہیں ہے کہ علمی لحاظ سے انہیں وہ مقام حاصل ہو، نہ یہ ضروری ہے کہ ہر ایک ایسا منتظم اعلیٰ ہو کہ وہ چھوٹے بڑے کو ساتھ لے کر چلنے کا قائل ہو۔ اسی لیے کسی بھی تحریک میں ان چیزوں کا پیدا ہونا ایک فکری عمل ہے، اور اگر اس تحریک میں جو انہوں نے برپا کی آپ یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی قیادت میں علمی کمی، جذباتیت یا بعض اوقات عدم توازن پایا جاتا ہے تو یہ ایک قدرتی عمل ہے، آپ ہر ایک کو ایک سانچے میں نہیں ڈھال سکتے، لیکن آپ یہ لازماً کرسکتے ہیں کہ جو بھی اہداف ہیں وہ آپ کی نظر میں رہیں، اور ہدف ہمیشہ سے یہی رہا ہے تحریک اسلامی کا کہ ایسے افراد پیدا کرے جن میں فکر بھی پاکیزہ ہو، سیرت بھی پاکیزہ ہو، اور جو معاشرے میں تبدیلی لانے والے بن سکیں۔ یہ تین پہلو ایسے ہیں جو مولانا مودودی نے اپنی تحریر اور زندگی سے پیش کیے، اور یہی میرے نزدیک ان کی تحریک کی خصوصیت کا پہلو ہے۔

**فرائیڈے اسپیشل:** ایک خیال یہ ہے کہ تبدیلی کے لیے انتخابی سیاست کے راستے پر مولانا اپنے آخری دنوں میں مایوس تھے وہ شاید کچھ عرصے اور حیات رہتے تو اس طریقہ تبدیلی سے رجوع کرلیتے۔؟ آپ اس خیال کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** میرا خیال ہے کہ مولانا مودودی نے بہت سوچ بچار کے بعد وہ موقف اختیار کیا تھا جس پر وہ آخر تک قائم رہے، انہوں نے بہت تحقیق سے فاشزم، کمیونزم اور سرمایہ داری کا مطالعہ کیا تھا، جس کی واضح مثال ان کی ''تنقیحات'' اور ''سود'' سمیت وہ تمام تحریرات ہیں جو انہوں نے اپنے پیچھے چھوڑی ہیں۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ تبدیلی اگر آئے گی تو وہ دستوری ذرائع ہی سے آئے گی، جس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ برطانوی پارلیمانی نظام یا امریکی صدارتی نظام ہی مسائل کا حل ہے۔ دستوری ذرائع کا مطلب یہ ہے کہ توڑ پھوڑ کی سے تبدیلی نہیں آسکتی۔ تبدیلی کے لیے طویل عرصہ تطہیر افکار اور تعمیر سیرت کی ضرورت ہے۔ تبدیلی ایک فطری عمل ہے، جب بھی افراد کار اس قابل ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ امامت، امارت اور قیادت سونپ دے، وہ اس میں تاخیر نہیں کرے گا۔ تعمیری تبدیلی مشروط ہے ان انسانوں کی جماعت سے جو قرآن کی چلتی پھرتی تصویر ہوں۔ رہا یہ معاملہ کہ جہادی طریقہ اسلامی نہیں ہے تو مولانا نے اس وقت جب پوری امت مسلمہ معذرت پسند رویہ کے ساتھ جہاد پر بات کرنے سے گریز کررہی تھی کھل کر علمی اور قرآنی دلائل سے یہ بات ثابت کی کہ جہاد اسلام کا رکن ہے اور قیامت تک رہے گا۔ ہاں جہاد کا مطلب نہ خون خرابہ ہے نہ خودکش حملے بلکہ وہ منظم و مرتب اور ذمہ دارانہ جدوجہد جس میں جو کچھ انسان کے اختیار میں ہے اسے لگا دیا جائے۔ گویا تبدیلی دستوری اور پرامن ذرائع سے ہونی چاہیے، جو اسی وقت ممکن ہے جب افراد کی تربیت فکری اور عملی تطہیر کی شکل میں ہو اور وہ تبدیلی کا ذریعہ بنے۔ یہ بات پیش نظر رہے کہ مولانا قوت کے استعمال کو مکمل رد نہیں کرتے۔ اس کی واضح مثال ان کی وہ علمی کاوش ہے جسے ''الجہاد فی الاسلام'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ وہ جہاد کے موضوع پر بغیر کسی

> **ہم اقبال کو بھی سال میں ایک مرتبہ محض رسماً خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ عملاً ہم نے اقبال کو بھلا دیا ہے۔ اگر ہم اقبال کو صحیح طور پر اپنے تعلیم و تربیت کے عمل میں شامل کرتے تو ہمارے ہاں ترقی ہوتی علم وفن کے اندر، سیرت وکردار کے اندر، معاشرت کے اندر، ہر جگہ ترقی ہوتی**



معذرت کے دوٹوک بات کرتے ہیں۔ یہ بات ہر ایک جانتا ہے کہ جہاد پر مولانا کی اس تحریر کے محرک مولانا محمد علی جوہر تھے اور جہاد کے موضوع پر مولانا کے یہ مضامین توازن و اعتدال کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں جہاد ایک اصلاحی عمل ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ جہاد ایک خونریز عمل ہے۔ اور اصلاحی عمل کا مطلب یہ ہے کہ آپ جس حد تک ممکن ہوگا ایک طبیب کی طرح سے حالات کی اصلاح کریں گے۔ لیکن اگر کہیں پر جراحت کی ضرورت ہے تو اس بناء پر کہ جراحت ایک نازک عمل ہے کیا آپ مریض کو مرنے دیں گے؟ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہوا کہ آپ جراحت کا نشتر لے کر ہر ایک کو اس سے کریدتے پھریں۔ گویا کہ ان کا جو مائنڈ سیٹ ہے وہ یہ کہ آپ دستوری ذرائع سے، وہ ذرائع جو پبلک ہیں، جو صبر آزما ہیں، جو طویل ہیں، جن کے لیے ضروری ہے کہ انبیائے کرام کے طریقے کی پیروی کرتے ہوئے آپ نرم گفتاری کے ساتھ، بھلائی کے ساتھ ایک چیز کو لوگوں کے دلوں میں بٹھائیں، ان میں تبدیلی پیدا ہو، اس تبدیلی کے اثرات ظاہر ہوں ان کے طرزِ عمل سے، ان کے معاملات وہ ہوں جو دوسروں کے لیے مثال ہوں، ایک مخالف بھی یہ کہے کہ مجھے اگر کسی رفاہی کام میں پیسہ لگانا ہے تو چاہے میں ووٹ ان کو دوں نہ دوں لیکن یہی لوگ امانت دار اور قابلِ اعتماد ہیں۔ ان کے معاملات درست ہیں۔ اس لیے اللہ کے نام پر جو کچھ خرچ کرنا ہے تو وہ ان کے ذریعے خرچ ہو۔ یہ وہ امیج ہے جو اُسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب آپ ایک طویل عمل کے ذریعے افراد کی تطہیرِ فکر کرتے ہوئے، تعمیرِ سیرت کرتے ہوئے انہیں بطور ایک نمونے کے پیش کریں کہ یہ وہ عام شہری ہیں جن کے ذریعے مثالی معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔

**فرائیڈے اسپیشل:** مولانا نے بھی اس نظام کو مختلف جگہوں پر گلاسڑا نظام کہا، زہر کے پیالوں سے تشبیہ دی، اس کی کیا وجہ تھی؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** ان تمام چیزوں کا جب میں تجزیہ کرتا ہوں تو صرف دو الفاظ ان تمام چیزوں کا حل ہیں، ایک ہے تبدیلیٔ اقتدار اور ایک ہے تبدیلیٔ نظام۔ مولانا قائل ہیں تبدیلیٔ نظام کے جبکہ تبدیلیٔ اقتدار مسئلے کا حل نہیں ہوتی لیکن حل معلوم ہوتی ہے۔ حزب التحریر نے یہی سوچا کہ پہلے تبدیلیِ اقتدار ہو اور جب اقتدار ہاتھ میں آجائے تو تبدیلی کا عمل ہوگا اور پھر پہاڑی کی چوٹی سے نور بہتا ہوا آجائے گا نیچے تک، مولانا اس کے قائل نہیں ہیں، مولانا یہ سمجھتے ہیں کہ تبدیلیٔ نظام ہونا چاہیے۔ نظام کیسے بدلے گا؟ توڑ پھوڑ سے؟ خون خرابے سے؟ جنگ و جدال سے؟ نہیں! وہ نظام بدلے گا اس طریقے سے جس نظام میں آپ افراد کو تیار کرسکیں۔ مولانا مودودی اور علامہ اسد کا مشترکہ موقف اگر آپ سمجھنا چاہیں تو دونوں کو پڑھیے تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ دونوں اس بات کے قائل تھے کہ پاکستان کی تحریک کے اندر جو بڑی کمی رہی وہ یہ تھی کہ سرکردہ افراد وہ تھے جو نواب، جاگیردار، انگریز کی طرف سے اعزاز یافتہ بیوروکریٹس، جن کو یہ بات معلوم تھی کہ جمعہ کی نماز پڑھنا بہت کافی ہے اسلام کے قیام کے لیے اور یہ بات علامہ اسد نے اپنی تحریرات میں کھل کر بیان کی ہے اور اس کا ذکر مولانا مودودی کی تحریروں میں بھی ملتا ہے، کیا محض ملک حاصل کرنا ہے یا وہ نظام جس کے ذریعے اس ملک میں وہ ادارے ہوں جن میں اسلامی اصول کارفرما ہوں اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب آپ کے پاس ایسے معیشت کے ماہر، دفاع کے ماہر، سائنس کے ماہرین، ادب و ثقافت کے ماہرین ہوں جن کا نقطۂ نظر اسلامی ہو، اس کا نام ہے تبدیلیٔ نظام۔ تبدیلیٔ نظام کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ حکومت پر قابض ہوگئے، آپ نے جھنڈا لگالیا اسلام کا اور جو کچھ ہورہا ہے وہ ہوتا رہے۔ یہ بنیادی فرق اگر سمجھ لیا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مولانا مودودی تبدیلیٔ نظام کے داعی ہیں، تبدیلیِ اقتدار کے قائل نہیں ہیں۔

**فرائیڈے اسپیشل:** پاکستان 1947ء میں معرضِ وجود میں آیا اور 1971ء میں دولخت ہوگیا۔ آخر 24 سال میں ایسا کیا ہوا کہ ہمارا مشرقی بازو ہم سے الگ ہوگیا؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** دیکھیے! پاکستان نہیں ٹوٹا بلکہ وہ افراد جو پاکستان کے قائل نہیں تھے وہ پاکستان کے جسم کے ایک حصے کو یک کھلی حکمتِ عملی کے ذریعہ کاٹنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ وہ افراد تھے جو روزِ اوّل سے لسانیت، صوبائیت کے علم بردار تھے، جن کی نگاہ میں پاکستانیت محض ایک تبدیلیٔ نام تھی اور انہوں نے یہ چاہا کہ وہ بنگال کی زبان کی تحریک کو، اور دس فیصد ہندو آبادی کے 90 فیصد مسلمان آبادی کے ہونے کے باوجود عدم توازن پیدا کرکے ایک تبدیلی وہاں پر لے آئیں۔ اگر وہ افراد جو اس کے محرک تھے اور وہ جن کے ہاتھوں یہ کام ہوا، تصورِ پاکستان کے قائل ہوتے تو یہ بات کبھی نہ ہوتی۔ میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود شیخ مجیب الرحمٰن نے شاید خود بھی نہ سوچا ہو کہ وہ الگ ہوجائیں گے۔ جو بھی مذاکرات ہورہے تھے وہ تھے بارگیننگ آف پاور کے، لیکن جب ایک شخص کو آپ دیوار سے لگادیں اور کہیں کہ ”تم کچھ نہیں، سب کچھ ہم ہیں، اِدھر ہم اُدھر تم“ تو وہ مجبور ہوگیا، اور جب آپ نے کہا کہ ”اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی جو اُس طرف رخ کرے گا“ یہ سیاست کے لیے بہت ہی نازیبا کلمات ہیں، کیونکہ سیاست کا مطلب ہوتا ہے کہ دروازے کھلے رہیں بند نہ ہوں یہ ہمارا اپنا ایک سیاسی گناہ تھا جس کی بنا پر ملک دولخت ہوا۔ اس کا تعلق نظریۂ پاکستان کے ساتھ نہیں ہے۔ نظریۂ پاکستان تو آج بھی برقرار ہے، آج بھی اتنا ہی زندہ ہے جتنا پہلے تھا، اور جو کچھ آج مودی ہندوستان میں کررہا ہے اس نے ثابت کردیا کہ نظریۂ پاکستان ہی درست تھا۔ یہ جو تصور تھا کہ ہندو اور مسلمان ساتھ رہ سکتے ہیں وہ ختم ہوچکا ہے۔ چار مہینے سے جو ظلم و ستم کشمیر میں ہورہا ہے وہ اپنی جگہ، لیکن جو جو ذلت آمیز رویہ ہندوستان میں سات دہائیوں سے مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان کا رہا ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ اگر آج پاکستان نہ بنتا اور آپ ایک قوم ہوتے تو کیا آپ آج اپنا نام باقی رکھ سکتے تھے؟ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ وہاں کے نظامِ تعلیم نے، وہاں کے ماحول نے اُن گھرانوں کو جو اپنے آپ کو بہت مسلمان گھرانا کہتے تھے، یہ کہنے پر آمادہ کردیا کہ ہم تو اصل میں ہندی ہیں، اسلام ہمارا ذاتی مذہب ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو ان کا مقصود تھا، اور آج بھی ہے۔ اور اسی کے خلاف علامہ اقبال، قائداعظم، مولانا مودودی، علامہ اسد نے جہاد کیا، اور یہ چیز ان حالیہ واقعات سے ثابت ہوجاتی ہے کہ نظریۂ پاکستان درست تھا اور آج بھی اتنا ہی زندہ ہے جتنا پہلے تھا، کیونکہ اس کی بنیاد یہی تھی کہ ہماری قومیت، ہماری نسل، ہماری نسبت، پہچان اور شخصیت صرف اسلام ہے۔ ہم رنگ و نسل، زبان

> **بعض اصطلاحات ہماری مستعار ہیں۔ مغربی ابلاغ عامہ کسی کو فنڈامنٹلسٹ، بنیاد پرست، کسی کو رائٹسٹ یا لیفٹسٹ کہتے ہیں، ہم اسی کو صحافت میں عام کردیتے ہیں، اس پر حاشیے لکھتے ہیں، کالم لکھتے ہیں اور ٹی وی پر اس پر گفتگو کی جاتی ہے، حالانکہ ہمارے یہاں ان اصطلاحات کا استعمال کیا جانا قطعاً مناسب نہیں**





> علمی ترقی ہوتی ہے اُس وقت جب آپ علم کو ترجیحات میں اولین مقام دیں۔ اگر علم کو معلومات سمجھ لیا جائے تو وہ علم نہیں رہتا۔ ہم نے بجائے علم کے، معلومات کو بنیاد بنالیا ہے۔ یعنی انفارمیشن ٹیکنالوجی کا مطلب ہم نے یہ لے لیا ہے کہ معلومات تیزی کے ساتھ جتنی زیادہ مل جائیں اتنی ہی اچھی بات ہے۔ لیکن ان معلومات میں علم کہاں ہے؟ حکمت کہاں ہیں؟ نتائج کہاں ہیں؟

اور کسی اور عصبیت کے بندے نہیں ہیں، ہم صرف اللہ کے بندے ہیں۔ اس بنیاد پر ہم نے ایک ملک کو حاصل کیا اور قائم کیا اور اسی چیز کو آج انڈیا میں ثابت کیا جارہا ہے کہ تم جو مسلمان اپنے آپ کو کہتے ہو یہ تمہاری جگہ نہیں ہے، یہ تو ہندوؤں کی جگہ ہے، ہندوتوا ہے، مسلمانوں کا کام یہاں پر کیا ہے؟ تم کیسے کہتے ہو کہ ہمارے آباواجداد دوسو سال سے یہاں پر تھے؟ اور ہم ہندوستانی ہیں، ہم نہیں مانتے اس بات کو۔ یہ کس بات کا ثبوت ہے! یعنی پوری تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ صرف سقوطِ ڈھاکہ ہی نہیں بلکہ جو بھی حالات اس خطے میں رہے ہیں وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ نظریہ آج بھی زندہ ہے اور درست تھا۔ اس کی موت کبھی واقع نہیں ہوئی۔ یہ محض ہمارا واہمہ ہے، اور خاص طور پر جو افراد خود کو لبرل، سیکولر اور روشن خیال قرار دیتے ہیں یہ ان کا پھیلایا ہوا واہمہ ہے جس کو ہمارے ابلاغ عامہ نے، صحافت میں اور برقی ابلاغ دونوں میں اتنا دوہرایا ہے کہ عوام کا ذہن دھندلا گیا ہے۔

**فرائیڈے اسپیشل:** لیکن کیا ملک ٹوٹنے کی ذمہ داری صرف بھٹو کے چند جملوں پر ہے؟

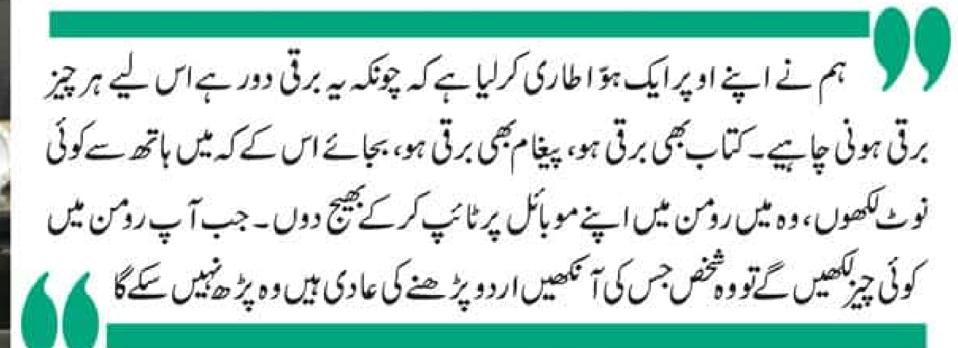
**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** میں نے قطعاً یہ نہیں کہا، میں نے کہا کہ وہ افراد جو نظریہ پاکستان سے وابستگی اور وفاداری نہیں رکھتے تھے، یہ بیوروکریٹس بھی تھے، فوج میں بھی تھے، سیاست میں بھی تھے، تاجر بھی تھے۔ آپ بتائیے کہ قائداعظم کے ساتھ جو لوگ شامل ہوئے کیا وہ سرکاری اعزاز یافتہ نہیں تھے؟ ہمارے پہلے وزیر خارجہ ''سر'' کا خطاب رکھتے تھے۔ یہ لوگ اسلام کے وفادار تھے یا تاج برطانیہ کے وفادار تھے؟ یہ کس کے خلیفہ ہوسکتے تھے؟ جو بہت سے افراد ہمارے یہاں برسرِ اقتدار آئے آپ کو علم ہے کہ جب چودھری رحمت علی نے پاکستان کا نام تجویز کیا تو کس نے اس کی مخالفت کی؟ ظفر اللہ خاں نے کہا یہ بالکل ناقابلِ عمل تصور ہے، بعد میں جو جو حالات پیش آئے، جو بھٹو نے کیا وہ اسی ذہنیت کا تسلسل تھا جو ہمارے پورے نظام پر قابض ہے۔

**فرائیڈے اسپیشل:** پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا اور 1973ء میں پاکستان کو اسلامی آئین بھی مل گیا۔ ہمارا پورا نظامِ حکومت اور نظامِ ریاست خلافِ اسلام تصورات پر کھڑا ہوا ہے۔ ہماری معیشت غیر اسلامی ہے، ہمارا عدالتی نظام اسلامی نہیں ہے، ہمارے تعلیمی نظام میں اسلام کہیں موجود نہیں ہے، ہمارا پولیس کا بندوبست ابھی تک برٹش لا کو follow کررہا ہے۔ زندگی کے کسی شعبے میں ہم نے اسلام کے نام پر پیش رفت نہیں کی، اس کا کیا سبب ہے؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** وجوہات تو بنیادی طور پر تین ہیں، ایک تو یہ کہ ہمارا نظامِ تعلیم وہی رہا جو انگریز نے چھوڑا۔ اس کے نتیجے میں زندگی دو خانوں میں بٹ جاتی ہے، ایک خانہ ہے مذہب کا، ایک خانہ ہے دنیا کا اور ان دونوں کے درمیان توازن کو ہم کامیاب زندگی سمجھتے رہے ہیں۔ اسلام دعوت دیتا ہے توحید کی، گویا روزِ اوّل سے ہم توحید کے منافی تعلیم دیں گے تو کیا توحیدی امت پیدا ہوجائے گی؟ نہیں ہوسکتی۔ یوں سمجھیے روزِ اوّل سے جو بیوروکریسی یا نوکرشاہی ہمارے ورثے میں آئی اس میں ایک بڑی تعداد اُن افراد کی تھی جو اس ملک کے شہری بھی نہیں تھے۔ 1964ء تک ساٹھ سے اوپر افراد وہ تھے جو برطانیہ کی شہریت رکھتے ہوئے ہمارے اہلکار تھے۔ ان میں سے بہت سے غیر مسلم تھے۔ ریکارڈ تلاش کریں تو جوائنٹ سیکریٹری اور سیکریٹری تک ایسے لوگ ملیں گے جو غیر مسلم بھی تھے اور ان کا اور ہمارا مفاد یکساں نہیں تھا۔ وہ کیا کرتے یہاں پر؟ کس قسم کا نظام نافذ کرتے؟ کس بات کو حمایت کرتے؟ یہی شکل ہماری فوج کی تھی۔ فوج کی تربیت کہاں پر ہوئی تھی؟ ڈیرہ دون میں انگریز کے قائم کردہ ادارے میں کس نے کی تھی؟ انگریز نے کی تھی، آج بھی جاکر دیکھ لیں، آپ کے پاس جو اسکول اُس زمانے میں سرحد اور پنجاب میں قائم کیے گئے تھے، ان کے اندر افسران کے فوٹو لگے ہوئے ہیں ان کمانڈنٹس کے جنھوں نے اسے قائم کیا۔ یہ سارے افراد وہ تھے جو برطانوی مفاد کے امین تھے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوتا؟ پھر یہ بھی ہے کہ ہم نے اسلام کو براہِ راست قرآن وسنت سے کبھی سمجھنا نہیں چاہا۔ ہمارے علمائے کرام نے بھی شروع سے ہمیں یہ بات بتائی کہ چند عبادات کا اہتمام نجات کے لیے کافی ہے، اور باقی کام کرتے رہو دنیا کے لیے۔ کبھی یہ نہیں کہا کہ آپ اپنے پورے نظام کو اسلام کے مطابق کیجیے، بلکہ یہ کہا کہ جو بھی آپ کاروبار کررہے ہیں کرتے رہیں، اس میں سے خیرات نکال دیں اللہ کے لیے، سب کچھ پاک صاف ہوجائے گا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر میں کالا کاروبار کررہا ہوں اور اس میں سے زکوٰۃ ادا کررہا ہوں تو کیا وہ سب سفید ہوجائے گا؟ ہم دین اور دنیا کی تفریق کے تصور پر شدت سے قائم رہے۔ یہ تفریق محض تعلیم میں نہیں بلکہ ان افراد میں بھی آج تک برقرار ہے جو دین کا علم بھی رکھتے ہیں۔ مجھے بتایئے دینی مدارس خود کو دینی کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے کہ وہاں پر قرآن کا حفظ، قرآن کی تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت پاک کے بارے میں تعلیم دی جاتی ہے لیکن اگر کوئی مدرسہ میں پڑھنے والا طالب علم ایک سیکولر اسکول میں یا سرکاری اسکول میں چلا جاتا ہے تو کیا کہا جاتا ہے؟ یہ تو دین کو چھوڑ کر دوسرا علم حاصل کررہا ہے۔ یہ تقسیم ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا نامناسب ہوگا کہ یہ محض سیکولر افراد کا کارنامہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں غیر شعوری طور پر ہمارا دینی طبقہ بھی شامل رہا ہے۔

مجھے بتایئے اگر آپ کسی صاحب سے ملتے ہیں جن کی وضع قطع بڑی مناسب ہے، وہ شیروانی پہنتے ہیں، چوغہ پہنتے ہیں، جناح کیپ یا عمامہ پہنے ہوئے ہیں، ہاتھ میں تسبیح ہے اور آپ روز دیکھتے ہیں ان کو مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے، آپ کیا کہتے ہیں؟ بہت دیندار آدمی ہے۔ کیا آپ نے معلوم کیا کہ ان کا یہ لباس کہاں سے آیا ہے؟ ان کے گھر کے اندر جو چِکن ہے وہ کہاں سے چل رہا ہے؟ ہم نے دین کو ظواہر میں تبدیل کردیا ہے، اور دین کا جو اصل مقصد تھا تبدیلیِ کردار، تقویٰ اس کو بھی ہم نے منسوب کردیا چند مظاہر سے۔ گویا ہم نے اصلاح کو سمجھنا نہیں چاہا۔ اگر اسلام کو سمجھنا چاہتے تو قرآن ہم کو یہ بتاتا کہ دین تو پورے مجموعۂ زندگی کا نام ہے، وہ تو دین کے اندر مکمل داخل ہونے کا نام ہے۔ دین جز وقتی نہیں ہے کہ جمعہ کو مسلمان ہوجاؤ اور پیر کے دن سلام کرو ڈالر کو، اور منگل کے دن سلام کرو کسی عسکری قوت کو، اور بدھ کے دن سلام کرو کسی ثقافتی قوت کو...... اس کا نام تو دین نہیں ہے۔ لیکن ہم نے کہا کہ نہیں ہماری ثقافت انڈیا سے آئے گی یا امریکہ سے آئے گی، ہمارا دفاع وہاں سے آئے گا، ہماری معیشت وہاں سے آئے گی، ہم نماز پڑھیں گے ضرور خشوع وخضوع کے ساتھ۔ یہ دین کو نہ سمجھنے کے باعث ہے۔ اگر دین کو سمجھتے اور نافذ کرتے تو حالات مختلف ہوتے۔

**فرائیڈے اسپیشل:** پوری مسلم دنیا کا اس وقت یہ حال ہے کہ ہمارا جو ظاہر ہے وہ تو زیادہ سے زیادہ اسلامی ہوتا چلا جارہا ہے، داڑھی رکھنے والوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے، پردہ




رکھنے والی خواتین میں بھی اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے، لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہمارا باطن سیکولر ہوتا جارہا ہے، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہماری خواہشیں، ہماری آرزوئیں، ہماری تمنائیں، ہمارے سارے خواب مغرب سے امپورٹ ہورہے ہیں۔ اس دورنگی کا کیا سبب ہے اور اس سے ہم کیسے نکل سکتے ہیں؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** محض مادّیت نہیں بلکہ اس کی وجہ وہ ذہنی غلامی ہے جس سے ہم آج تک آزاد نہیں ہوسکے۔ مجھے بتائیے کہ جب آپ ایک شخص کو اسلام پر خطاب کرتے ہوئے دیکھتے ہیں بڑی عمدہ انگریزی کے اندر، تو آپ کیا کہتے ہیں؟ بہت بڑا اسکالر ہے۔ اگر وہی بات ایک شخص اردو میں کہہ رہا ہے تو اسے ایک مسجد کے خطبہ سے تعبیر کرتے ہیں؟ یہ ہماری ذہنی غلامی ہے، چاہے اس کو ہم محسوس نہ کریں۔

**فرائیڈے اسپیشل:** ہمارے معاشرے کے توے پچانوے فیصد دانشوروں کو دیکھیں، اسکالرز کو دیکھیں، علماء کو دیکھیں......سب میں یہ دورنگی نظر آتی ہے؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** یہ محض دورنگی نہیں ہے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ذہنی طور پر اس چیز کو افضل سمجھنا جس پر یورپ اور امریکہ کی چھاپ پائی جاتی ہے، یہ ذہنی غلامی ہے۔ اگر ایک شخص بغیر انگریزی الفاظ استعمال کیے آدھے گھنٹے اردو میں بات کرتا ہے تو آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عصری مسائل اور مغربی فکر سے ناواقف ہے، اس کو نہیں پتا کہ دنیا میں کیا ہورہا ہے۔ اب اگر وہی شخص پانچ الفاظ انگریزی کے شامل کرلے گفتگو میں، تو ہم کہتے ہیں کہ بھئی بڑا انٹی لیکچوئل ہے، دانشور ہے۔ یہ کس بات کی علامت ہے؟

**فرائیڈے اسپیشل:** کہنے والے کہتے ہیں کہ ہمارے زوال کا سبب قول وفعل کا تضاد ہے اور اس میں ہمارے معاشرے کے تمام طبقے بشمول علماء، دانشور سب ملوث ہیں اور ہمارے یہاں رول ماڈل کا کال پڑ گیا ہے؟

باتیں کرنے سے تو زندگی نہیں بدلتی، اقبال نے کہا ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں ہے نہ نوری ہے نہ ناری

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** اقبال جو بات کہہ رہے ہیں اور قرآن پاک کی ترجمانی ہے قرآن کہتا ہے کہ رب کریم کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ وہ کہا جائے جو کیا نا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہم نے دوعملی کے رویّے کو اختیار کیا ہوا ہے کہ ہمارا خود عمل یکساں نہیں ہے جو جان جوکھوں کا کام ہے اور جس کی بنا پر مولانا مودودی کی تحریک پاپولر نہیں بن سکی اور شاید نہیں بن سکے گی۔ کیونکہ ہر فرد اس بات پر آمادہ نہیں ہوسکتا کہ وہ ہر وہ چیز اختیار کرے جو دین چاہتا ہے۔ جو بنیادی شرط انہوں نے اپنے دستور میں رکھی تھی وہ یہی تھی کہ قول وفعل میں تضاد نہ ہو۔ جو ایک شخص کہتا ہے اس پر عمل بھی کرے اور اسی بنا پر وہ ایک محدود جماعت کو اپنے ساتھ پیدا کرسکے، زیادہ افراد پیدا نہیں کرسکے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ عددی طور پر کم ہونا قوت کم ہونے کی علامت نہیں ہے۔ بلکہ عددی طور پر کم ہونا قوت کی علامت ہوسکتا ہے اور رہا ہے۔ دنیا میں عوامی انقلاب کثرت تعداد سے کبھی نہیں آئے۔ ہمیشہ ایک چھوٹی سی تعداد نے انقلابات برپا کیے ہیں خواہ وہ فرانس کا ہو، روس کا ہو، کیوبا کا ہو، کہیں کا بھی ہو۔ تاریخ اٹھا کر دیکھیے آپ کو پتا لگے گا کہ یہ عوامی انقلابات نہیں تھے اور اگر مولانا مودودی نے یہ رویہ اختیار کیا کہ وہ ایک جماعت ایسی پیدا کرسکیں چاہے محدود ہو لیکن ان کا کردار، ان کا طرزِ عمل، ان کی گفتگو اور عمل ایک ہو تو یہی وہ راستہ ہے جو قرآن وسیرت نے ہمیں سکھایا ہے اور یہی ہمارا المیہ ہے۔ اگر ہم یہ چیز کرسکیں اور ہم کرسکتے ہیں کہ ہماری نئی نسل کا قول وعمل یکساں ہو تو ہم سے بہتر کوئی قوم نہیں ہوسکتی جو آگے بڑھے۔

**فرائیڈے اسپیشل:** یعنی تبدیلی کے لیے پورے معاشرے کو تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اگر جو لوگ اس کو لے کر اٹھے ہیں یا جو یہ کام کررہا ہے وہ ایک استاد بھی ہوسکتا ہے، ایک جماعت بھی ہوسکتی ہے۔ وہ جو بات کہہ رہا ہو اس میں اخلاص موجود ہو اور اس کے عمل سے بھی نظر آتا ہو؟ تو اس کا کیا سبب ہے۔ جیسے یونیورسٹی کی مثال لے لیں، استادوں کا زوال بھی ہمارے سامنے موجود ہے، علماء کا بھی موجود ہے، دانشوروں کا بھی موجود ہے لیکن جب یہی فیکٹری ہے جو نسل کو تیار کرتی ہے وہی متاثر ہوگئی ہے، یا پھر یہ کہ آج کے باپ کا کردار بھی ویسا ہی ہے، ظاہر ہے وہ بھی معاشرے کا ایک فرد ہے اور بنیادی چیزیں ہی تباہ ہوگئی ہیں تو آپ کیا سمجھتے ہیں ان کے درست ہوئے بغیر بھی کوئی اور راستہ ہے؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** جی ہاں، تبدیلی کے آغاز کے لیے کثرت تعداد شرط نہیں ہے، قوت کردار شرط ہے۔ ہر خرابی کی اصلاح ہوسکتی ہے اور ہر مشکل دور کی جاسکتی ہے اور یہ اُس وقت ہوسکتا ہے جب آپ اپنے معاشرے سے تین بنیادی باتوں کو دور کرسکیں۔ ایک ہے انفرادیت، دوسری ہے مادیت، اور تیسری ہے اخلاقی اضافیت۔

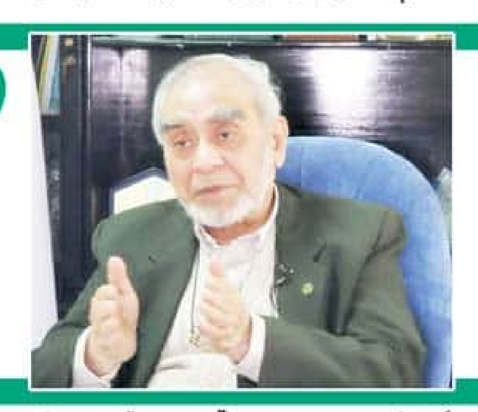
پہلی کا تعلق اس چیز سے ہے کہ میں چاہے باپ ہوں یا ماں ہوں، یا بیٹا یا بھائی یا بہن میں ہی سب کچھ ہوں، یہ جسم میرا ہے، میرے مطالبات اور میری اصل بنیادی چیز ہیں۔ میرے مطالبات مانے جائیں، میرا حصہ مجھے ملے۔ یہ انفرادیت ہے جو ہمارے معاشرے میں نفوذ کرگئی ہے، اور یہ ضد ہے اسلام کی اجتماعیت کی۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ہم نے محض مادّی منفعت کو بنیاد بنا لیا ہے۔ آپ نے استاد کی مثال دی۔ اگر وہ ایک کالج یا یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہے اور اس سے امید کی جاتی ہے کہ وہ ایک گھنٹہ جو ساٹھ منٹ کا ہوگا، کلاس میں صرف کرے گا، جب کہ عملاً یہ ہوتا ہے کہ وہ دس منٹ لیٹ آیا اور دس منٹ پہلے کلاس سے نکل گیا اس بنا پر کہ اسے جاکر کہیں اور پڑھانا ہے، تو وہ یہ کیوں کررہا ہے؟ پیسے کے حصول کے لیے، کہ اس کو تنخواہ دو جگہ سے مل سکے۔ اس طرح جو یہ پیغام دے رہا ہے، اس کے طلبہ بھی آگے چل کر ایسا ہی کریں گے۔ یہ مادّیت ہے جو ہر سطح پر ہے، یہ محض ایک استاد کا معاملہ نہیں ہے۔ اور ایسے ہی اخلاقی اضافیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک اخلاق اپنے لیے ہے اور ایک دوسرے کے لیے۔ ہم نے اخلاق کے دو معیارات کو دین ودنیا کی تفریق کی طرح جزو ایمان بنالیا ہے۔

**فرائیڈے اسپیشل:** استاد جو رویہ اختیار کررہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ معاشرتی جبر اور ہمارے نظام کے جبر کا شکار ہے۔ ظاہر ہے جہاں وہ ملازمت کررہا ہے وہاں سے اس کے اخراجات پورے نہیں ہورہے اور وہ اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کوشش کررہا ہے۔ اس پر مادّیت کا لیبل لگانا بھی تو انصاف نہیں ہوگا؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** جی ہاں لیکن اس کے عملاً دوسرے پہلو بھی ہیں مثلاً ایک شخص ضروریات پوری کرنے کے لیے دو ملازمتیں کرتا ہے۔ لیکن اگر ہزاروں خواہشیں ایسی پیدا

ہو جائیں جن میں سے ہر ایک پر ہر ایک شخص کا دم نکلنے لگے تو پھر وہ ضروریات کیسے پوری ہوں گی! ایک شخص جو اجتماعیت پر یقین رکھتا ہے اپنے گھر کے اندر سات افراد کے ساتھ ایک ہانڈی سے اپنا پیٹ بھر سکتا ہے، جب وہ ایک ''فرد'' بن جائے گا انفرادی حیثیت میں یا مادّیت کے تحت آ جائے گا تو پھر ایک ہانڈی کام نہیں کر سکتی، پھر تو گھر کے ہر فرد کو ایک ایک پیزا چاہیے ہوگا۔ ہر ایک کے پیزا کے لیے ضرورت ہوگی اس ہانڈی کے مقابلے میں دس گنا زیادہ رقم ادا کرنے کی، وہ رقم کہاں سے آئے گی؟ وہ آئے گی دو تین کام کرنے سے۔ یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے، یہ ایک گھن چکر ہے۔ ایک گھر یہ سمجھتا ہے کہ ایک تنخواہ سے کام نہیں ہو سکتا۔ کس بنا پر؟ اس بنا پر کہ اس کو روز نیا کپڑا استعمال کرنا ہے آفس میں قابلِ قبول بننے کے لیے، اس کو ٹرانسپورٹ استعمال کرنی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے کام اسی وقت ہوں گے جب دو تنخواہیں آئیں۔ گویا ہم نے اپنی ضروریات کو، اپنے مطالبات کو معروضی طور پر نہیں دیکھا، بلکہ جتنا چاہا بڑھنے دیا۔ جتنے مطالبات بڑھیں گے آپ اتنے ہی غریب ہو جائیں گے۔ تو یہ جو آغاز میں گزارش کی کہ انفرادیت، مادیت اور اخلاقی اضافیت یہ تین ایسے عوامل ہیں جن کا ہم شکار رہے ہیں اور اس وقت بھی ہیں، اور ان کا علاج ہو سکتا ہے۔ اور ان کا علاج ہے تعلیم کے ذریعے، ابلاغِ عامہ کے ذریعے، ایسی مثالوں کے ذریعے کہ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں۔

مجھے بتائیے آپ کا تعلق ابلاغِ عامہ کے ساتھ ہے، کیا ہمارے ابلاغِ عامہ نے کبھی یہ غور کیا کہ ایک رکشہ والے کو وہ کہتے ہیں کہ وہ اجنبی گاہک سے دگنے پیسے لیتا ہے لیکن ایسے رکشہ والے بھی تو ہیں کہ اگر کوئی ان کے پاس اپنا پرس بھول گیا تو انہوں نے جا کر پہنچا دیا۔ کیا ایسے افراد کو ابلاغِ عامہ اجاگر کرتا ہے؟ ان کو کبھی پروجیکٹ کیا گیا؟ ایک استاد کو ہم کہتے ہیں کہ وہ تنخواہیں پیدا کرتا ہے، تو ایسے استاد بھی تو ہیں جو ایک جگہ کام کر رہے ہیں اور محنت سے کر رہے ہیں، کیا ان کو کسی نے تسلیم کیا؟ ان کے بارے میں کوئی بات ہوئی؟ کیا ہر باپ اور ماں وہی ہے جو خود غرض ہے؟ لیکن ہم نے جو تصور اختیار کیا ہوا ہے وہ سنسنی خیزیت، وہ ہے احساسیت کو ختم کرنا۔ اگر آپ ایک شخص کو صبح سے شام تک مار دھاڑ دکھاتے رہیں گے تو مار دھاڑ اسے معمول ہی نظر آئے گا، اُس کے لیے مار دھاڑ کوئی حیرت کی چیز نہیں ہوگی۔ ہم نے ان چیزوں کے گھناؤنے پن کو ختم کر دیا جو کل تک گھناؤنی تھیں۔ ان کی تکرار ہے ان کو گلیمرائز کر کے، ان کو بار بار پیش کر کے۔ تو مسئلہ محض ایک نہیں ہے۔ اور ان سب چیزوں کی اصلاح ہو سکتی ہے اُس وقت جب ابلاغِ عامہ، تعلیم، ریاستی پالیسی، منبر و محراب ان سب کا ایک مطمحِ نظر ہو، اور وہ یہ ہو کہ دین کے جامع تصور کو سمجھتے ہوئے تبدیلی کی کوشش کریں۔



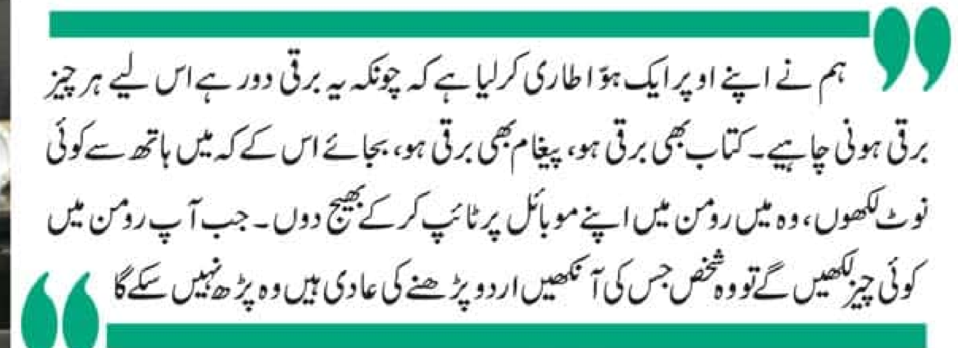
جتنا علمی کام مسلمانوں نے کیا ہے وہ کچھ کم نہیں ہے۔ لیکن اس کے بارے میں معلومات کی کمی ہے۔ مجھے بتائیے جو کام ترکی زبان میں، حتیٰ کہ فارسی کے اندر کسی سائنس دان نے کیا ہے کیا ہمارے کسی علمی جریدے میں اس کی خبر آئی ہے؟ جو کام سوڈان میں ہوا ہے ہمیں اس بارے میں کوئی معلومات ہے؟ اگر کوئی پاکستانی کوئی کام کر لیتا ہے تو کیا ہم اسے قرار واقعی اہمیت دیتے ہیں؟ کام ہر جگہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے لیکن ہم جس چیز کو دیکھتے ہیں وہ مخصوص یورپی اور امریکی اداروں کی علمی درجہ بندی ہے

**فرائیڈے اسپیشل:** مسلمانوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب مسلمانوں نے جہاں جہاں بھی بڑے کارنامے اور معرکے انجام دیے اس کی بنیاد یا تو اُن کی للّٰہیت تھی یا اُن کی علمی فضیلت۔ لیکن اب کئی صدیاں گزر گئی ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان للّٰہیت کے حوالے سے بھی تہی دامن ہوتے جا رہے ہیں، علمی فضیلت بھی اُن کے پاس نظر نہیں آتی۔ آخر اس صورتِ حال کا سبب کیا ہے اور اس سے مسلمان کیسے نکل سکتے ہیں؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** میں سمجھتا ہوں کہ ہم آج بھی ان دونوں صفات کے لحاظ سے کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ہمارے ملک کے اندر ہزار ہا دینی مدارس ایسے ہیں جن کے ہاں کم از کم دو گرم کھانے فراہم کیے جاتے ہیں۔ یہ ہاتھ پھیلا کر کسی سے نہیں مانگتے۔ یہ پیسے آسمان سے آتے ہیں ان کے پاس؟ اگر ایک یونیورسٹی اپنا کانووکیشن کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے وہ بجٹ بناتی ہے اور بمشکل ایک چائے یا ایک کھانا دے کر سمجھتی ہے کہ بہت احسان کر دیا، لیکن یہ جو تین سو پینسٹھ دن ان کے پاس وسائل آ رہے ہیں کہاں سے آ رہے ہیں؟ للّٰہیت ہے ناں! کیا جو ان کو دے رہا ہے اس لیے دے رہا ہے کہ اس کا اشتہار آئے گا؟ اس کو ٹی وی پر چیک دیتے ہوئے دکھائیں گے؟ نہیں! میرے علم میں نہیں ہے۔ کسی ایک دینی مدرسے کے لیے جو رقم لوگ دیتے ہیں کبھی آپ نے دیکھا ہو ٹی وی یا کسی کیمرے نے اسے دکھایا ہو۔ یہ کیا ہے؟ للّٰہیت ہی تو ہے، لیکن ہم ایسا کبھی سوچتے نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ کا زاویۂ نگاہ درست ہے تو آپ کو للّٰہیت اور تقویٰ جگہ جگہ مل جائے گا، کمی نہیں ہے اس کی۔

مسئلہ یہ ہے کہ یہ للّٰہیت اور تقویٰ اس مقام تک نہیں پہنچا جہاں پر وہ حالات کو تبدیل کرنے کے لیے ذریعہ بن جائے۔ ذریعہ بنے گا اُس وقت جب اس کے پاس اختیار ہو، قوتِ تنفیذ ہو۔ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جہاں تک بات رہی علمی برتری کی، میں سمجھتا ہوں کہ گزشتہ نصف صدی میں جتنا علمی کام مسلمانوں نے کیا ہے وہ کچھ کم نہیں ہے۔ لیکن اس کے بارے میں معلومات کی کمی ہے۔ مجھے بتائیے جو کام ترکی زبان میں، حتیٰ کہ فارسی کے اندر کسی سائنس دان نے کیا ہے کیا ہمارے کسی علمی جریدے میں اس کی خبر آئی ہے؟ جو کام سوڈان میں ہوا ہے ہمیں اس بارے میں کوئی معلومات ہے؟ اگر کوئی پاکستانی کوئی کام کر لیتا ہے تو کیا ہم اسے قرار واقعی اہمیت دیتے ہیں؟ کام ہر جگہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے لیکن ہم جس چیز کو دیکھتے ہیں وہ مخصوص یورپی اور امریکی اداروں کی علمی درجہ بندی ہے Quality enhancement کے مطابق وہ کیا مقام رکھتا ہے۔ لیکن کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ ہم نے کوشش کی ہو یہ معلوم کرنے کی کہ ترکی میں اسلام پر، معیشت پر، معاشرت پر جو کچھ طبع ہوا ہے گزشتہ دو سے پانچ سال میں ان مطبوعات کو کس حد تک لوگوں نے پڑھا ہے۔ آپ کو جان کر شاید حیرت ہو کہ ترکی اور ایران میں بالعموم جو چیز بھی مغربی جامعات سے طبع ہوتی ہے وہ چند مہینوں میں ترجمہ ہو کر مقامی زبان میں آ جاتی ہے، جبکہ ہمارے ہاں جو چیز 1960ء میں طبع ہوئی ہے اسے آج تک ہم گھس رہے ہیں۔ آپ علم کی وسعت، نئے زاویے اور علم کے دروازے بند کر دیں گے تو علم کیسے پھیلے گا؟ اس کے باوجود پاکستان میں کام ہوا ہے اور آپ ہی کے ملک سے معیشت پر لوگوں نے ایوارڈ حاصل کیے ہیں، اسلامی معیشت اور اسلامی فکر پر مولانا مودودی کے علاوہ دو پاکستانیوں کو فیصل ایوارڈ دیا گیا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں کمی تو کہی جا سکتی ہے لیکن کام برابر ہوا ہے اور ہو رہا ہے، اور امپیکٹ فیکٹر مضامین میں ہمارے بہت سے مسلم ممالک بہت آگے بڑھے ہیں، بہت اضافے ہوئے ہیں، لیکن مزید آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔

**فرائیڈے اسپیشل:** ایک سادہ سا سوال ہے کہ مغرب کے عروج کی کیا وجہ ہے؟ اور کیا واقعی مغرب اور مغربی تہذیب زوال پذیر ہے؟ اور ہے تو زوال کا یہ سفر کچھ لمبا نہیں




رکھنے والی خواتین میں بھی اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے، لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہمارا باطن سیکولر ہوتا جارہا ہے، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہماری خواہشیں، ہماری آرزوئیں، ہماری تمنائیں، ہمارے سارے خواب مغرب سے امپورٹ ہورہے ہیں۔ اس دورنگی کا کیا سبب ہے اور اس سے ہم کیسے نکل سکتے ہیں؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** محض مادیت نہیں بلکہ اس کی وجہ وہ ذہنی غلامی ہے جس سے ہم آج تک آزاد نہیں ہوسکے۔ مجھے بتائیے کہ جب آپ ایک شخص کو اسلام پر خطاب کرتے ہوئے دیکھتے ہیں بڑی عمدہ انگریزی کے اندر، تو آپ کیا کہتے ہیں؟ بہت بڑا اسکالر ہے۔ اگر وہی بات ایک شخص اردو میں کہہ رہا ہے تو اسے ایک مسجد کے خطبہ سے تعبیر کرتے ہیں؟ یہ ہماری ذہنی غلامی ہے، چاہے اس کو ہم محسوس نہ کریں۔

**فرائیڈے اسپیشل:** ہمارے معاشرے کے تو پچانوے فیصد دانشوروں کو دیکھیں، اسکالرز کو دیکھیں، علماء کو دیکھیں...... سب میں یہ دورنگی نظر آتی ہے؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** یہ محض دورنگی نہیں ہے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ذہنی طور پر اس چیز کو افضل سمجھنا جس پر یورپ اور امریکہ کی چھاپ پائی جاتی ہے، یہ ذہنی غلامی ہے۔ اگر ایک شخص بغیر انگریزی الفاظ استعمال کیے آدھے گھنٹے اردو میں بات کرتا ہے تو آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عصری مسائل اور مغربی فکر سے ناواقف ہے، اس کو نہیں پتا کہ دنیا میں کیا ہورہا ہے۔ اب اگر وہی شخص پانچ الفاظ انگریزی کے شامل کرلے گفتگو میں، تو ہم کہتے ہیں کہ بھئی بڑا انٹلیکچوئل ہے، دانشور ہے۔ یہ کس بات کی علامت ہے؟

**فرائیڈے اسپیشل:** کہنے والے کہتے ہیں کہ ہمارے زوال کا سبب قول وفعل کا تضاد ہے اور اس میں ہمارے معاشرے کے تمام طبقے بشمول علماء، دانشور سب ملوث ہیں اور ہمارے یہاں رول ماڈل کا کال پڑ گیا ہے؟

باتیں کرنے سے تو زندگی نہیں بدلتی، اقبال نے کہا ہے

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں ہے نہ نوری ہے نہ ناری

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** اقبال جو بات کہہ رہے ہیں اور قرآن پاک کی ترجمانی ہے قرآن کہتا ہے کہ رب کریم کو یہ بات سخت ناپسند ہے کہ وہ کہا جائے جو کیا نہ جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ہم نے دوعملی کے رویّے کو اختیار کیا ہوا ہے کہ ہمارا خود عمل یکساں نہیں ہے جو جان جوکھوں کا کام ہے اور جس کی بنا پر مولانا مودودی کی تحریک پاپولر نہیں بن سکی اور شاید نہیں بن سکے گی۔ کیونکہ ہر فرد اس بات پر آمادہ نہیں ہوسکتا کہ وہ ہر وہ چیز اختیار کرے جو دین چاہتا ہے۔ جو بنیادی شرط انہوں نے اپنے دستور میں رکھی تھی وہ یہی تھی کہ قول وفعل میں تضاد نہ ہو۔ جو ایک شخص کہتا ہے اس پر عمل بھی کرے اور اسی بنا پر وہ ایک محدود جماعت کو اپنے ساتھ پیدا کرسکے، زیادہ افراد پیدا نہیں کرسکے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ عددی طور پر کم ہونا قوت کم ہونے کی علامت نہیں ہے۔ بلکہ عددی طور پر کم ہونا قوت کی علامت ہوسکتا ہے اور رہا ہے۔ دنیا میں عوامی انقلاب کثرتِ تعداد سے کبھی نہیں آئے۔ ہمیشہ ایک چھوٹی سی تعداد نے انقلابات برپا کیے ہیں خواہ وہ فرانس کا ہو، روس کا ہو، کیوبا کا ہو، کہیں کا بھی ہو۔ تاریخ اٹھا کر دیکھیے آپ کو پتا لگے گا کہ یہ عوامی انقلابات نہیں تھے اور اگر مولانا مودودی نے یہ رویہ اختیار کیا کہ وہ ایک جماعت ایسی پیدا کرسکیں چاہے محدود ہو لیکن ان کا کردار، ان کا طرزِ عمل، ان کی گفتگو اور عمل ایک ہو تو یہی وہ راستہ ہے جو قرآن وسیرت نے ہمیں سکھایا ہے اور یہی ہمارا المیہ ہے۔ اگر ہم یہ چیز کرسکیں اور ہم کرسکتے ہیں کہ ہماری نئی نسل کا قول وعمل یکساں ہو تو ہم سے بہتر کوئی قوم نہیں ہوسکتی جو آگے بڑھے۔

**فرائیڈے اسپیشل:** یعنی تبدیلی کے لیے پورے معاشرے کو تبدیل کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اگر جو لوگ اس کو لے کر اٹھے ہیں یا جو یہ کام کررہا ہے وہ ایک استاد بھی ہوسکتا ہے، ایک جماعت بھی ہوسکتی ہے۔ وہ جو بات کہہ رہا ہو اس میں اخلاص موجود ہو اور اس کے عمل سے بھی نظر آتا ہو؟ تو اس کا کیا سبب ہے۔ جیسے یونیورسٹی کی مثال لے لیں، استادوں کا زوال بھی ہمارے سامنے موجود ہے، علماء کا بھی موجود ہے، دانشوروں کا بھی موجود ہے لیکن جب یہی فیکٹری ہے جو نسل کو تیار کرتی ہے وہی متاثر ہوگئی ہے، یا پھر یہ کہ آج کے باپ کا کردار بھی ویسا ہی ہے، ظاہر ہے وہ بھی معاشرے کا ایک فرد ہے اور بنیادی چیزیں ہی تباہ ہوگئی ہیں تو آپ کیا سمجھتے ہیں ان کے درست ہوئے بغیر بھی کوئی اور راستہ ہے؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** جی ہاں، تبدیلی کے آغاز کے لیے کثرتِ تعداد شرط نہیں ہے، قوتِ کردار شرط ہے۔ ہر خرابی کی اصلاح ہوسکتی ہے اور ہر مشکل دور کی جاسکتی ہے اور یہ اُس وقت ہوسکتا ہے جب آپ اپنے معاشرے سے تین بنیادی باتوں کو دور کرسکیں۔ ایک ہے انفرادیت، دوسری ہے مادیت، اور تیسری ہے اخلاقی اضافیت۔

پہلی کا تعلق اس چیز سے ہے کہ میں چاہے باپ ہوں یا ماں ہوں، یا بیٹا یا بھائی یا بہن میں ہی سب کچھ ہوں، یہ جسم میرا ہے، میرے مطالبات اور میری اصل بنیادی چیز ہیں۔ میرے مطالبات مانے جائیں، میرا حصہ مجھے ملے۔ یہ انفرادیت ہے جو ہمارے معاشرے میں نفوذ کرگئی ہے، اور یہ ضد ہے اسلام کی اجتماعیت کی۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ہم نے محض مادّی منفعت کو بنیاد بنالیا ہے۔ آپ نے استاد کی مثال دی۔ اگر وہ ایک کالج یا یونیورسٹی میں پڑھارہا ہے اور اس سے امید کی جاتی ہے کہ وہ ایک گھنٹہ جو ساٹھ منٹ کا ہوگا، کلاس میں صرف کرے گا، جب کہ عملاً یہ ہوتا ہے کہ وہ دس منٹ لیٹ آیا اور دس منٹ پہلے کلاس سے نکل گیا اس بنا پر کہ اسے جاکر کہیں اور پڑھانا ہے، تو وہ یہ کیوں کررہا ہے؟ پیسے کے حصول کے لیے، کہ اس کو تنخواہ دو جگہ سے مل سکے۔ اس طرح جو یہ پیغام دے رہا ہے، اس کے طلبہ بھی آگے چل کر ایسا ہی کریں گے۔ یہ مادّیت ہے جو ہر سطح پر ہے، یہ محض ایک استاد کا معاملہ نہیں ہے۔ اور ایسے ہی اخلاقی اضافیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک اخلاق اپنے لیے ہے اور ایک دوسرے کے لیے۔ ہم نے اخلاق کے دو معیارات کو دین و دنیا کی تفریق کی طرح جزوِ ایمان بنالیا ہے۔

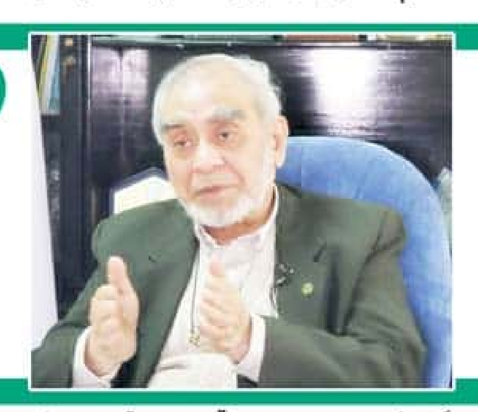
**فرائیڈے اسپیشل:** استاد جو رویہ اختیار کررہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ معاشرتی جبر اور ہمارے نظام کے جبر کا شکار ہے۔ ظاہر ہے جہاں وہ ملازمت کررہا ہے وہاں سے اس کے اخراجات پورے نہیں ہورہے اور وہ اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کوشش کررہا ہے۔ اس پر مادّیت کا لیبل لگانا بھی تو انصاف نہیں ہوگا؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** جی ہاں لیکن اس کے عملاً دوسرے پہلو بھی ہیں مثلاً ایک شخص ضروریات پوری کرنے کے لیے دو ملازمتیں کرتا ہے۔ لیکن اگر ہزاروں خواہشیں ایسی پیدا

ہو جائیں جن میں سے ہر ایک پر ہر ایک شخص کا دم نکلنے لگے تو پھر وہ ضروریات کیسے پوری ہوں گی! ایک شخص جو اجتماعیت پر یقین رکھتا ہے اپنے گھر کے اندر سات افراد کے ساتھ ایک ہانڈی سے اپنا پیٹ بھر سکتا ہے، جب وہ ایک "فرد" بن جائے گا انفرادی حیثیت میں یا مادّیت کے تحت آجائے گا تو پھر ایک ہانڈی کام نہیں کر سکتی، پھر تو گھر کے ہر فرد کو ایک ایک پیزا چاہیے ہوگا۔ ہر ایک کے پیزا کے لیے ضرورت ہوگی اس ہانڈی کے مقابلے میں دس گنا زیادہ رقم ادا کرنے کی، وہ رقم کہاں سے آئے گی؟ وہ آئے گی دو تین کام کرنے سے۔ یہ ایک لامتناہی سلسلہ ہے، یہ ایک گھن چکر ہے۔ ایک گھر یہ سمجھتا ہے کہ ایک تنخواہ سے کام نہیں ہو سکتا۔ کس بنا پر؟ اس بنا پر کہ اس کو روز نیا کپڑا استعمال کرنا ہے آفس میں قابلِ قبول بننے کے لیے، اس کو ٹرانسپورٹ استعمال کرنی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے کام اسی وقت ہوں گے جب دو تنخواہیں آئیں۔ گویا ہم نے اپنی ضروریات کو، اپنے مطالبات کو معروضی طور پر نہیں دیکھا، بلکہ جتنا چاہا بڑھنے دیا۔ جتنے مطالبات بڑھیں گے آپ اتنے ہی غریب ہو جائیں گے۔ تو یہ جو آغاز میں گزارش دھاڑ دکھاتے رہیں گے تو مار دھاڑ اسے معمول ہی نظر آئے گا، اُس کے لیے مار دھاڑ کوئی حیرت کی چیز نہیں ہوگی۔ ہم نے ان چیزوں کے گھناؤنے پن کو ختم کر دیا جو کل تک گھناؤنی تھیں۔ ان کی تکرار ہے ان کو گلیمرائز کر کے، ان کو بار بار پیش کر کے۔ تو مسئلہ محض ایک نہیں ہے۔ اور ان سب چیزوں کی اصلاح ہو سکتی ہے اُس وقت جب ابلاغِ عامہ، تعلیم، ریاستی پالیسی، منبر و محراب ان سب کا ایک مطمحِ نظر ہو، اور وہ یہ ہو کہ دین کے جامع تصور کو سمجھتے ہوئے تبدیلی کی کوشش کریں۔

**فرائیڈے اسپیشل:** مسلمانوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب مسلمانوں نے جہاں جہاں بھی بڑے کارنامے اور معرکے انجام دیے اس کی بنیاد یا تو اُن کی للّٰہیت تھی یا اُن کی علمی فضیلت۔ لیکن اب کئی صدیاں گزر گئی ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان للّٰہیت کے حوالے سے بھی تہی دامن ہوتے جا رہے ہیں، علمی فضیلت بھی اُن کے پاس نظر نہیں آتی۔ آخر اس صورتِ حال کا سبب کیا ہے اور اس سے مسلمان کیسے نکل سکتے ہیں؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** میں سمجھتا ہوں کہ ہم آج جہاں پر وہ حالات کو تبدیل کرنے کے لیے ذریعہ بن جائے۔ ذریعہ بنے گا اُس وقت جب اس کے پاس اختیار ہو، قوتِ تنفیذ ہو۔ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جہاں تک بات رہی علمی برتری کی، میں سمجھتا ہوں کہ گزشتہ نصف صدی میں جتنا علمی کام مسلمانوں نے کیا ہے وہ کچھ کم نہیں ہے۔ لیکن اس کے بارے میں معلومات کی کمی ہے۔ مجھے بتائیے جو کام ترکی زبان میں، حتیٰ کہ فارسی کے اندر کسی سائنس دان نے کیا ہے کیا ہمارے کسی علمی جریدے میں اس کی خبر آئی ہے؟ جو کام سوڈان میں ہوا ہے ہمیں اس بارے میں کوئی معلومات ہے؟ اگر کوئی پاکستانی کوئی کام کر لیتا ہے تو کیا ہم اسے قرارِ واقعی اہمیت دیتے ہیں؟ کام ہر جگہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے لیکن ہم جس چیز کو دیکھتے ہیں وہ مخصوص یورپی اور امریکی اداروں کی علمی درجہ بندی ہے Quality enhancement کے مطابق وہ کیا مقام رکھتا ہے۔ لیکن کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ ہم نے کوشش کی ہو یہ معلوم کرنے کی کہ ترکی میں اسلام پر، معیشت پر، معاشرت پر جو کچھ طبع ہوا ہے گزشتہ دو سے پانچ سال میں ان مطبوعات کو کس حد تک لوگوں نے پڑھا



> جتنا علمی کام مسلمانوں نے کیا ہے وہ کچھ کم نہیں ہے۔ لیکن اس کے بارے میں معلومات کی کمی ہے۔ مجھے بتائیے جو کام ترکی زبان میں، حتیٰ کہ فارسی کے اندر کسی سائنس دان نے کیا ہے کیا ہمارے کسی علمی جریدے میں اس کی خبر آئی ہے؟ جو کام سوڈان میں ہوا ہے ہمیں اس بارے میں کوئی معلومات ہے؟ اگر کوئی پاکستانی کوئی کام کر لیتا ہے تو کیا ہم اسے قرارِ واقعی اہمیت دیتے ہیں؟ کام ہر جگہ ہوا ہے اور ہو رہا ہے لیکن ہم جس چیز کو دیکھتے ہیں وہ مخصوص یورپی اور امریکی اداروں کی علمی درجہ بندی ہے

کی کہ انفرادیت، مادیت اور اخلاقی اضافیت یہ تین ایسے عوامل ہیں جن کا ہم شکار رہے ہیں اور اس وقت بھی ہیں، اور ان کا علاج ہو سکتا ہے۔ اور ان کا علاج ہے تعلیم کے ذریعے، ابلاغِ عامہ کے ذریعے، ایسی مثالوں کے ذریعے کہ لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں۔

مجھے بتائیے آپ کا تعلق ابلاغِ عامہ کے ساتھ ہے، کیا ہمارے ابلاغِ عامہ نے کبھی یہ غور کیا کہ ایک رکشہ والے کو وہ کہتے ہیں کہ وہ اجنبی گاہک سے دگنے پیسے لیتا ہے لیکن ایسے رکشہ والے بھی تو ہیں کہ اگر کوئی ان کے پاس اپنا پرس بھول گیا تو انہوں نے جا کر پہنچا دیا۔ کیا ایسے افراد کو ابلاغِ عامہ اجاگر کرتا ہے؟ ان کو کبھی پروجیکٹ کیا گیا؟ ایک استاد کو ہم کہتے ہیں کہ وہ تنخواہیں پیدا کرتا ہے، تو ایسے استاد بھی تو ہیں جو ایک جگہ کام کر رہے ہیں اور محنت سے کر رہے ہیں، کیا ان کو کسی نے تسلیم کیا؟ ان کے بارے میں کوئی بات ہوئی؟ کیا ہر باپ اور ماں وہی ہے جو خودغرض ہے؟ لیکن ہم نے جو تصور اختیار کیا ہوا ہے وہ سنسنی خیزیت، وہ بے احساسیت کو ختم کرنا۔ اگر آپ ایک شخص کو صبح سے شام تک مار بھی ان دونوں صفات کے لحاظ سے کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ہمارے ملک کے اندر ہزارہا دینی مدارس ایسے ہیں جن کے ہاں کم از کم دو گرم کھانے فراہم کیے جاتے ہیں۔ یہ ہاتھ پھیلا کر کسی سے نہیں مانگتے۔ یہ پیسے آسمان سے آتے ہیں ان کے پاس؟ اگر ایک یونیورسٹی اپنا کانووکیشن کرنا چاہتی ہے تو اس کے لیے وہ بجٹ بناتی ہے اور بمشکل ایک چائے یا ایک کھانا دے کر سمجھتی ہے کہ بہت احسان کر دیا، لیکن یہ جو تین سو پینسٹھ دن ان کے پاس وسائل آ رہے ہیں کہاں سے آ رہے ہیں؟ للّٰہیت ہے ناں! کیا جو ان کو دے رہا ہے اس لیے دے رہا ہے کہ اس کا اشتہار آئے گا؟ اس کو ٹی وی پر چیک دیتے ہوئے دکھائیں گے؟ نہیں! میرے علم میں نہیں ہے۔ کسی ایک دینی مدرسے کے لیے جو رقم لوگ دیتے ہیں کبھی آپ نے دیکھا ہو ٹی وی یا کسی کیمرے نے اسے دکھایا ہو۔ یہ کیا ہے؟ للّٰہیت ہی تو ہے، لیکن ہم ایسا کبھی سوچتے نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ کا زاویۂ نگاہ درست ہے تو آپ کو للہیت اور تقویٰ جگہ جگہ مل جائے گا، کمی نہیں ہے اس کی۔

مسئلہ یہ ہے کہ یہ للّٰہیت اور تقویٰ اس مقام تک نہیں پہنچا ہے۔ آپ کو جان کر شاید حیرت ہو کہ ترکی اور ایران میں بالعموم جو چیز بھی مغربی جامعات سے طبع ہوتی ہے وہ چند مہینوں میں ترجمہ ہو کر مقامی زبان میں آجاتی ہے، جبکہ ہمارے ہاں جو چیز 1960ء میں طبع ہوئی ہے اسے آج تک ہم گھس رہے ہیں۔ آپ علم کی وسعت، نئے زاویے اور علم کے دروازے بند کر دیں گے تو علم کیسے پھیلے گا؟ اس کے باوجود پاکستان میں کام ہوا ہے اور آپ ہی کے ملک سے معیشت پر لوگوں نے ایوارڈ حاصل کیے ہیں، اسلامی معیشت اور اسلامی فکر پر مولانا مودودی کے علاوہ دو پاکستانیوں کو فیصل ایوارڈ دیا گیا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں کمی تو کہی جا سکتی ہے لیکن کام برابر ہوا ہے اور ہو رہا ہے، اور امپیکٹ فیکٹر مضامین میں ہمارے بہت سے مسلم ممالک بہت آگے بڑھے ہیں، بہت اضافے ہوئے ہیں، لیکن مزید آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔

**فرائیڈے اسپیشل:** ایک سادہ سا سوال ہے کہ مغرب کے عروج کی کیا وجہ ہے؟ اور کیا واقعی مغرب اور مغربی تہذیب زوال پذیر ہے؟ اور ہے تو زوال کا یہ سفر کچھ لمبا نہیں

ہوگیا؟

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد: مغرب کے عروج کا سبب وہی ہے جو کبھی ہمارا تھا، ہم نے محنت کی توجہ کے ساتھ، قربانی کے ساتھ، عالمی تحقیق کو وقت دیا، نتائج نکلے۔ فرق یہ تھا کہ ہم نے کام اس لیے کیے کہ اس کا مطالبہ ہمارے رب نے ہم سے کیا تھا، جبکہ مغرب نے یہ کام اس لیے کیا کہ اس میں اُس کے لیے منفعت تھی، مادّی فائدہ تھا۔ اہداف مختلف تھے لیکن کام ایک تھا۔ مجھے بتایئے کہ مغرب کی کون سی یونیورسٹی یا ادارہ ایسا ہوگا کہ جہاں پر ایک شخص جب داخل ہوتا ہے اور جب نکلتا ہے، اس پورے عرصے میں وہ اپنے کام میں مصروف رہتا ہے توجہ کے ساتھ؟ مقابلہ کیجیے جس جامعہ سے آپ نے پڑھا، یا جو آج کل کالج یا جامعات ہیں کیا وہاں پر ہر استاد یا طالب علم اس طرح داخل ہوتا ہے کہ جب وہ داخل ہورہا ہے تو یہ سمجھے کہ یہ مادرِ علمی ہی نہیں ہے بلکہ ایک مسجد ہے جہاں پر وہی اہتمام ہو جو ایک مسجد کا اہتمام ہوتا ہے۔ آپ مسجد میں جا کر فٹبال نہیں کھیلتے، مسجد میں جا کر آپ توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں، آخروقت تک کرتے ہیں۔ تو ایک سال کا نیویارک ٹائمز اٹھا کر دیکھ لیں تو وہ کوف مین ہو یا دوسرے افراد ہوں، روزانہ جو بات لکھ رہا ہے وہ کیا ہے؟ کہ یہ زوال کی آخری حد ہے۔ یہ چیز تحریری طور پر بار بار آرہی ہے۔ فرید زکریا نے امریکہ کے زوال پر پوری کتاب لکھ دی۔ خاندان مکمل ٹوٹ چکا، معیشت گروی رکھ دی گئی، امریکی ریاست خود 16 ٹریلین ڈالر کی مقروض ہے، ہم اس سے قرضہ مانگتے ہیں جو خود اپنے عوام کا مقروض ہے۔ ہماری تو ہر چیز ہی نرالی ہے، لیکن ہم مشاہدہ نہیں کرتے، مطالعہ نہیں کرتے۔ زوال تو ہورہا ہے اور ہے، جیسے اقبال نے کہا تھا، مولانا مودودی نے کہا تھا۔ انہوں نے یہ بات کہی تھی کہ وہ وقت آرہا ہے جب اشتراکیت ماسکو میں اور سرمایہ داری واشنگٹن میں کانپے گی، پریشان ہوگی۔ تو اشتراکیت کا جنازہ تو دفن بھی ہو چکا اب دوسرا مریض اس راستے پر چل رہا ہے۔

فرائیڈے اسپیشل: مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو گزشتہ دوسو سال میں ہمارے لیے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ مغرب سے ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے؟ امت مسلمہ اس سلسلے میں کوئی بھی فیصلہ نہیں کرسکی۔ امتِ مسلمہ میں کئی گروہ پائے جاتے ہیں، ایک گروہ مغرب کو حق سمجھتا ہے اور اسی کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ ایک طبقہ وہ ہے جو اسلام اور مغرب کا امتزاج بنانا چاہتا ہے۔ اور ایک بہت چھوٹا سا طبقہ جو مغرب کو اصولوں کی سطح پر، کلیات کی سطح پر دیکھتا ہے اور اپنی زندگی کے ہر پہلو کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ آخر امتِ مسلمہ میں مغرب کے حوالے سے اتنا کنفیوژن کیوں موجود ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد: جس چیز کا نام اسلام ہے وہ ایک ہدایت ہے، دعوت ہے اور پیغام ہے، اور وہ تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اس لیے مغرب ہو یا مشرق، ایک مسلمان کا زاویہ نظر یہ ہونا چاہیے کہ اسے اپنے دین کے پیغام کو بھلے انداز سے پھیلانا اور پہنچانا ہے، اس کا تعلق ایک داعی اور مدعو کا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تعلق دشمنی کا نہیں ہوسکتا، نفرت کا نہیں ہوسکتا بلکہ یہ ایک مسلسل مکالمے کا تعلق ہے۔ گویا اسلام یہ چاہتا ہے کہ اسلام کا ہر ماننے والا مشرق اور مغرب کے ساتھ ایک مکالمہ جاری رکھے جس میں وہ اپنی بات کو وضاحت کے ساتھ، آسانی کے ساتھ پیش کرتا رہے۔ اور اگر اس میں کامیابی ہوجاتی ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ نہیں ہوتی ہے جب بھی اسے مطمئن ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ ہمارا تصور یہ نہیں ہے کہ ہر وہ چیز جو مغرب کی ہے وہ اچھی یا بری ہے، بلکہ ہمارا تصور یہ ہے کہ ہمیں مشرق و مغرب دونوں کو اسلام کی اچھائیوں سے متعارف کرانا ہے، آگاہ کرنا ہے، اور اگر وہ کچھ چیزیں ایسی کررہے ہیں جو ہمارے اصول سے متصادم نہیں ہیں تو ہم اس کو منع نہیں کریں گے۔ فرض کیجیے کہ اگر ایک مغربی سرجن کان کی سرجری کا کوئی ایسا طریقہ ایجاد کرتا ہے جس سے لوگوں کی سماعت میں آسانی ہوجاتی ہے تو چونکہ وہ مغربی سرجن ہے ہم یہ کہیں گے کہ ہم اس طریقے کو اپنے اسپتالوں میں استعمال نہیں کریں گے؟ ہمارا دشمن ہے؟ نہیں! اگر کوئی فکر ایسی ہے جو انسانی حقوق سے تعلق رکھتی ہے اور وہی اسلام کہتا ہے ہم اس کی مخالفت تو نہیں کریں گے۔ اسلام کہتا ہے کہ حیا ایک قیمتی چیز ہے، اور مغرب کہتا ہے کہ حیا بے کار چیز ہے، یہ تو انسان کو دقیانوسی بناتی ہے، جتنا انسان عریاں ہوگا اتنا ترقی یافتہ ہوگا، ہم



> ترقی، کامیابی اور فلاح محض سائنسی ایجادات، جلیبی نما شاہراہوں اور طویل پلوں کی تعمیر کا نام ہے یا ایسے انسانی معاشرہ کے قیام کا نام ہے جہاں امن وسکون، عزت نفس، رشتوں کا احترام، خواتین، معمر افراد اور بچوں کی عزت وتحفظ پایا جاتا ہو، جہاں معاشی عدل ہو، جہاں دینی آزادی ہو، جہاں آنے والی نسلوں کے لیے محبت ہو یا ترقی کامیابی اور فلاح اس کا نام ہے کہ آپ گھر پر تنخواہ کتنی لے کر جاتے ہیں اور آپ کا مکان کتنے رقبے پر تعمیر ہوا ہے۔ اور آپ کی سواری کی گاڑی کی قیمت کیا ہے؟

کیا وہ یہ کررہا ہے؟ نہیں کرے گا تو نتائج کیا ہوں گے؟ گویا جو چیز ہم نے کی اور ہم کامیاب ہوئے اسی سے مغرب کامیاب ہوا۔ رہی بات زوال کی، تو اقبال نے تو بہت صاف یہ بات کہہ دی تھی کہ اس کی ظاہری چمک اور نمائش ہے جسے آپ دیکھ رہے ہیں، جبکہ اس کی اصل قوت تو ختم ہوچکی۔ اقبال مغربی تہذیب کی اپنے ہاتھوں خودکشی کا تذکرہ کرچکے ہیں اور تمام سائنسی ترقی کے باوجود مغرب آج جس اخلاقی اور معاشرتی زوال کا شکار ہے یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اقبال کے بعد قائد نے بھی کہا تھا اسٹیٹ بینک کے افتتاح کے موقع پر کہ یہ معیشت کینسر زدہ معیشت ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہوسکتا۔ ان دونوں افراد کے کہنے کے بعد آپ نے دیکھا جو کرائسز 2008ء میں ہوئے، سومعاشی شہروں میں جلوس نکالے گئے یہ طالبان نہیں تھے بلکہ کاروبار سے وابستہ افراد تھے، اور انہوں نے کہا کہ Capitalism and Secularism has failed جس پر کتابیں لکھی گئیں بلکہ آج تک لکھی جارہی ہیں۔ مجھے بتایئے کہ ایک ایسا ملک جو طاقتور ہونے کے دعوے کرتا ہے اُس کے اندر اس وقت اگر آپ گزشتہ اس تصور کو لازماً رد کردیں گے۔ گویا مغرب ہو یا مشرق، ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ ہمارا اپنا پیمانہ کیا کہتا ہے۔ اگر اسلام کہتا ہے کہ یہ چیز ہمارے لیے قابلِ قبول یا قابلِ گوارا ہے تو ہم اس کو گوارا کریں گے، اور اگر نہیں ہے تو اسے رد کریں گے، اس کا انکار کریں گے۔ ہمارا تعلق ہوگا مکالمے کا اور دعوتِ فکر کا۔ ہمارا تعلق وہ نہیں ہوگا جیسا بعض لوگ کہتے ہیں مستقل ٹکراؤ کا اور جہاد قرار دے کر اس کے خلاف برسرِپیکار رہنے کا۔ بلکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ آپ پوری دنیا کو اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچائیں حکمت کے ساتھ، محبت کے ساتھ، خلوص کے ساتھ، اور اس کو آخرکار اسلام کی آماجگاہ بنائیں۔

فرائیڈے اسپیشل: اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسو سال سے یہ طے نہیں کرپارہے ہیں کہ ہمارے تعلقات مغرب کے ساتھ کس نوعیت کے ہونے چاہئیں؟

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد: میرے خیال میں کنفیوژن بعض لوگوں کو ہو بھی سکتا ہے لیکن میری نگاہ میں کوئی کنفیوژن نہیں پایا جاتا۔ میں مطمئن ہوں کہ قرآن جو مجھے بتاتا

ہے وہ راستہ مکالمے کا ہے، وہ راستہ اپنی بات کو پیش کرنے کا دلائل کے ساتھ، بھلائی کے ساتھ، اس میں کوئی ٹکراؤ نہیں پایا جاتا ہے۔

**فرائیڈے اسپیشل:** ایک عمومی خیال ہے کہ مسلمانوں کا زوال اس وجہ سے ہوا کہ وہ علم و ہنر وفنون میں اور تسخیر کائنات میں پیچھے رہ گئے، مغرب نے ان میدانوں میں سبقت حاصل کی اور اُس نے عروج پایا؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** اس بات میں وزن ہے لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کیا ترقی، کامیابی اور فلاح محض سائنسی ایجادات، جلیبی نما شاہراہوں اور طویل پلوں کی تعمیر کا نام ہے یا ایسے انسانی معاشرہ کے قیام کا نام ہے جہاں امن وسکون، عزت نفس، رشتوں کا احترام، خواتین، معمر افراد اور بچوں کی عزت وتحفظ پایا جاتا ہو، جہاں معاشی عدل ہو، جہاں دینی آزادی ہو، جہاں آنے والی نسلوں کے لیے محبت ہو یا ترقی کامیابی اور فلاح اس کا نام ہے کہ آپ گھر پر تنخواہ کتنی لے کر جاتے ہیں اور آپ کا مکان کتنے رقبے پر تعمیر ہوا ہے۔ اور آپ کی سواری کی گاڑی کی قیمت کیا ہے؟

میں سمجھتا ہوں کہ معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کے باوجود اور اپنی بہت سی اسلامی اقدار کو بھلا دینے کے باوجود ہم آج بھی مغرب ومشرق سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ہم خود اپنی قدر سے آگاہ نہیں ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم مغرب کی سائنسی ترقی سے آگے نکلنے کی کوشش نہ کریں۔ اسلام ہر معاملہ میں نقطہ کمال یا اتقان کے حصول کا نام ہے۔ اس لیے ہمیں تجرباتی علوم میں آگے سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔

**فرائیڈے اسپیشل:** 1977ء تک پاکستان کی سیاست نظریاتی سیاست تھی، سیاسی جماعتیں نظریات کی بنیاد پر ایک دوسرے سے پنجہ آزمائی کرتی تھیں، لیکن جنرل ضیاء الحق کے اقتدار میں آنے کے بعد ہماری سیاست غیر نظریاتی ہوتی چلی گئی اور اب وہ یا تو لسانی اور صوبائی تعصب کی بنیاد پر آپریٹ کررہی ہے، یا پھر وہ سرمائے کی بنیاد پر کام کررہی ہے یا پھر وہ اسٹیبلشمنٹ کی گود میں بیٹھی ہمیں نظر آتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ پاکستانی سیاست کو دوبارہ نظریاتی سیاست میں کیسے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** میرے خیال میں آپ کے بنیادی مفروضے پر نظرثانی کی ضرورت ہے۔ قیام پاکستان سے قبل مسلم لیگ اسلامی ریاست کی داعی تھی، پاکستان کا مطلب کیا، لاالٰہ الااللہ کی تعبیر اس کے علاوہ کیا ہوسکتی ہے۔ لیکن قائداعظم کی وفات کے بعد اور خصوصاً قائد ملت کی شہادت کے بعد ہماری سیاست عصبیتوں اور طبقاتی نظام کی علم برداروں کی سیاست ہوگئی، اس میں ایوب خان نے فوج کو بھی ملوث کردیا چنانچہ بعد میں جو کچھ ہوا وہ اسی کا تسلسل تھا۔ جنرل ضیاء الحق بھی بظاہر "اسلامیت" کی ڈھال سے اپنا دفاع کرتے رہے۔ لیکن وہ اور ان کے رفقاء دس سال تک قرآن وسنت کے نظام کے قیام کو ترجیح اول ثابت نہیں کرسکے۔ ان کی اسلامیت بھی مسلم لیگی اسلامیت سے آگے نہیں بڑھی، اس لیے انھیں نظریاتی کہنا یا ان کے پروردہ سیاسی کرداروں کو نظریاتی کہنا حقیقت واقعہ سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ یہ سب معمولی فرق کے ساتھ اقتدار پر قابض رہنے والے افراد تھے۔

**فرائیڈے اسپیشل:** آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ نظریاتی پارٹی اور سیاست تھی ہی نہیں؟

**پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد:** جی، حتیٰ کہ وہ پارٹی بھی جسے کچھ عرصہ بظاہر غیر قانونی قرار دیا یعنی ممنوع قرار دیا گیا۔ سوشلسٹ فکر کے حامل جو مختلف ناموں سے آئے اُن کا نظریہ بھی کوئی نظریہ نہیں تھا، بلکہ وہ بھی سارے کے سارے مفاد پرست سرمایہ دارانہ ذہن رکھنے والے افراد تھے جو ذاتی اقتدار کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔ کوئی نظریاتی سیاست کرنے والا اگر کہتا ہے کہ سوشلزم مسائل کا حل ہے جب کہ وہ خود مالک ہو ساٹھ ہزار ایکڑ کا تو کیا یہ نظریاتی سیاست ہے؟ اس میں نظریہ ہے کہیں پر؟ جو دائیں اور بائیں کا تصور برطانیہ یا امریکہ میں پایا جاتا ہے، ہمارے ہاں اس کا وجود ہے ہی نہیں سرے سے۔ بلکہ ہمارے ہاں سیاست موروثی مفاد پرستوں کی رہی ہے، بس نام بدل کر آجاتے ہیں، اس لیے یہ کہنا بالکل بے بنیاد ہے کہ اس کا دور ختم ہوگیا۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو نظریہ اسلام نے دیا ہے اور جو نظریہ دیگر افراد کا ہے، یہ دو نظریات روزِ اوّل سے ہیں اور رہیں گے۔ اس بات کو یوں سمجھیے کہ پاکستان کے تناظر میں اسلامی جماعت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جماعت جو اسلام کی علَم بردار ہو۔ اسلامی نظریۂ حیات کا نفاذ ہر شعبے میں چاہتی ہو۔ وہ جماعت جو کھلم کھلا مسلک کی علَم بردار ہو اُسے مسلکی جماعت کہنا ہی عدل و انصاف کا تقاضا ہے۔ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ جمعیت علمائے اسلام (ف) ہیں، یا آپ جمعیت علمائے پاکستان ہیں یا جماعت اہلِ حدیث کے نمائندہ ہیں یا نفاذ فقہ جعفریہ کے نمائندہ ہیں، تو ان ناموں کے ساتھ کیا یہ جماعتیں اسلام کی علَم بردار جماعتیں کہلائی جاسکتی ہیں جب کہ سرکاری طور پر وہ مسلکی جماعتیں ہوں؟ یہ تقسیم ہی غلط ہے۔ اگر کہا جائے اسلامی، تو اس کا تو مطلب یہ ہے کہ وہ جماعت مسلکی نہ ہو اور اسلام کی ہو۔ لیکن چونکہ ہم نے ان تمام اصطلاحات کو گڈمڈ کیا ہوا ہے، اور بعض اصطلاحات ہماری مستعار ہیں۔ مغربی ابلاغ عامہ کسی کو فنڈامنٹلسٹ، بنیاد پرست، کسی کو رائٹسٹ یا لیفٹسٹ کہتے ہیں، ہم اسی کو صحافت میں عام کردیتے ہیں، اس پر حاشیے لکھتے ہیں، کالم لکھتے ہیں اور ٹی وی پر اس پر گفتگو کی جاتی ہے، حالانکہ ہمارے یہاں ان اصطلاحات کا استعمال کیا جانا قطعاً مناسب نہیں۔ ایسے میں یہ کہنا کہ اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ فلاں فلاں ہے۔ بشمول مسلکی جماعتوں کے کس نے فوج اور بیوروکریسی سے رشتہ نہیں جوڑا؟ مجھے بتائیے کون سی جماعت ہے جو خود کو حقیقتاً نظریاتی ثابت کرسکتی ہے؟ ہاں جب تک اسلام ایک مکمل نظام مانا جاتا رہے گا اُس وقت تک جو اس کے علَم بردار ہیں وہ اسلامی جماعت کہلائیں گے، اور وہ اس کا حق رکھتے ہیں۔ باقی افراد اپنا کوئی بھی نام رکھ لیں وہ بنیادی طور پر ایک مسلک کی بنیاد پر، ایک عصبیت کی بنیاد پر، ایک علاقائیت کی بنیاد پر، لسانیت کی بنیاد پر اپنا وجود رکھتے ہیں، ان کو ہم نظریاتی نہ کہہ سکتے ہیں، نہ کہنا چاہیے۔

**فرائیڈے اسپیشل:** پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ یہ نہ اسلامی بن سکا، نہ جمہوری بن سکا، نہ سیکولر بن سکا، نہ لبرل بن سکا۔ کیا اس کا سبب یہ ہے کہ جو ہماری فوجی اور سول اشرافیہ ہے اُس کا دراصل کوئی نظریۂ حیات ہی نہیں ہے، اور وہ معاشرے کو نظریاتی اعتبار سے چوں چوں کا مربہ بنا کر رکھنا چاہتی ہے؟

> آپ کو جان کر شاید حیرت ہو کہ ترکی اور ایران میں بالعموم جو چیز بھی مغربی جامعات سے طبع ہوتی ہے وہ چند مہینوں میں ترجمہ ہوکر مقامی زبان میں آجاتی ہے، جبکہ ہمارے ہاں جو چیز 1960ء میں طبع ہوئی ہے اسے آج تک ہم گھس رہے ہیں۔ آپ علم کی وسعت، نئے زاویے اور علم کے دروازے بند کردیں گے تو علم کیسے پھیلے گا؟



پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد: آپ کی دوسری بات کچھ حد تک درست معلوم ہوتی ہے، لیکن پہلی بات سے مجھے اختلاف ہے۔ پاکستان بننے سے قبل اور پاکستان بننے کے بعد اس بات کا اعلان کر دیا گیا تھا کہ یہ ایک اسلامی ریاست ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے امریکی شہریوں سے 1948ء میں خطاب کرتے وقت یہ بات کہی تھی کہ

Pakistan is the Premier Islamic State نہ صرف یہ بلکہ ایک سو کے لگ بھگ خطابات، بیانات اور پیغامات میں قائد نے یہ بات دوہرائی کہ "Now you have to stand guard over the development and maintenance of Islamic democracy, Islamic social justice and the equality of mankind in your own native soil."

(Feb 21,1948)

یہ بات عملاً 1956ء کے دستور میں آئی، لیکن وہ اس سے بہت پہلے یہ اعلان کر چکے تھے کہ پاکستان ایک اسلامی اسٹیٹ ہے۔ اور جو بانیٔ پاکستان کا اعلان ہے وہ بعد کے اعلانات سے زیادہ مستند ہے، پھر ہمارا دستور یہ بات صاف طور پر کہہ دیتا ہے کہ ہم اسلامی بھی ہیں اور جمہوری بھی ہیں، اور میں دستور کا احترام کرتا ہوں۔ اس لیے یہ کہنا غلط ہے کہ پاکستان میں نہ اسلام ہے نہ جمہوریت ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے دستور کا لازمی حصہ ہیں، اور جو بھی دستور کا احترام کرتا ہے اُس کو چاہیے کہ وہ اسے مانے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ اس پر عمل درآمد نہ کر رہے ہوں جس کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ کسی ملک میں جو دستوری حیثیت سے اسلامی ملک ہو، محض ''مسلم ملک'' نہ ہو، کسی کا یہ مطالبہ کرنا کہ یہاں سیکولر ریاست ہو، دستور کی واضح خلاف ورزی ہے۔ ملکی قانون میں ایسے باغیانہ بیانات پر واضح ہدایات ہونی چاہئیں۔

اس کے باوجود اسلام آزادیٔ رائے کا حق دیتا ہے اور ایک شخص ملکی دستور اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کرسکتا ہے لیکن اگر ملک کی 97فی صد آبادی ملک میں اسلامی نظام چاہتی ہو اور محض 3فی صد غیر مسلم یا سیکولر یا لبرل حضرات کی خواہش لادینی نظام کی ہو تو اور ایسے لوگ تھوڑی بہت عقل بھی رکھتے ہوں تو وہ خود یہ فیصلہ کریں کہ ان کا مطالبہ نام نہاد سیکولر جمہوریت کے کس اصول کی پیروی میں درست ہوسکتا ہے۔ اگر ان کے لیے محض عددی اکثریت حق اور ناحق کا فیصلہ کرتی ہے تو 97فی صد کے مقابلہ میں 3فی صد کا کسی خواہش کا رکھنا کیا کبھی درست ہوسکتا ہے؟

فرائیڈے اسپیشل: ادب کے دائرے میں مختلف نقطۂ نظر کے لوگ موجود ہیں، کچھ لوگ ادب برائے ادب کے قائل ہیں اور کچھ لوگ ادب برائے زندگی کے۔ آپ انسانی معاشرے میں ادب کے حقیقی کردار اور اہمیت کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد: میری نگاہ میں ادب انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ ادب کا مطلب ہے زندگی کو مؤدب کرنا، آدابِ زندگی کو اختیار کرنا، زندگی کو ادب کے ساتھ گزارنا، زندگی میں ایک نظم کا پایا جانا، خوبصورتی کا پایا جانا، توازن کا پایا جانا۔ اور جب یہ چیزیں ہم تحریروں میں منتقل کرتے ہیں تو یہ تحریر ادب بن جاتی ہیں۔ اگر ایک نظم ہے جس کا اصول یہ ہے کہ اس کے اشعار نو ہوں یا گیارہ ہوں، اور میں اس نظم کے اشعار ایک سو پانچ کردوں تو یہ نظم تو نہیں کہلائے گی۔ ادب کا مطالبہ یہ ہے کہ خود شعر و ادب کے اندر کچھ توازن ہوں، اس میں اوزان ہو، اس میں کوئی طریقہ ہو، اور زندگی کا مطلب بھی یہی ہے۔ زندگی کو مؤدب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی میں ایک توازن ہو، بھلائی ہو۔ اور اس لحاظ سے وہ ادب جسے ہم نثر یا نظم کہتے ہیں، زندگی کا لازمی حصہ ہے۔ قرآن کریم ان دونوں سے بلند ایک تحریر ہے۔ یہ نہ نظم ہے، نہ نثر ہے، یہ دونوں کو ہدایت دینے والا منبع ہے، اس کی روشنی میں آپ شعر اور نثر ایجاد کریں گے۔ اس کے پڑھنے کے بعد آپ میں ایک تحریک پیدا ہوگی۔ یہ ادب کی اعلیٰ ترین مثال ہے جس میں فکر ہو، توازن ہو، ندرت ہو، تخلیق ہو، اور ہر وہ چیز جو آپ سوچ سکتے ہیں۔ اس لیے جو ادب پیدا ہوا ہے قرآن کریم کی روشنی میں، وہ ادب مقصدی ہے، زندگی کے متعلق ہے، اس کے اندر وہ تصورات ہیں جو اسلام دیتا ہے۔ محبت ہے، امن ہے، صلح ہے، بھلائی ہے، فلاح ہے۔ یہ وہ ادب نہیں ہے جس میں مار دھاڑ، خون خرابہ، قتل و غارت پائی جائے، جو ایک زمانے میں نام نہاد ترقی پسند ادب کی پہچان ہوا کرتی تھی۔ یہ وہ ادب چاہتا ہے جس میں انسان کو انسانی اقدار، اخلاقی اقدار پر عمل کرنے کا درس ملے۔ ادب لازمی طور پر زندگی کا ایک بہت اہم شعبہ ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس پر توجہ بھی ہونی چاہیے، اس میں تعمیر بھی ہونی چاہیے۔ اقبال کا ہر شعر اس بات کی نمائندگی کرتا ہے کہ شعر کے اندر اُن مضامین کو جو قرآن کریم میں ہیں، پیش کیا جاسکتا ہے۔

فرائیڈے اسپیشل: بڑا ادب کیا ہوتا ہے اور بڑا ادیب کیسے پیدا ہوتا ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد: جیسے میں نے عرض کیا کہ قرآن کریم آفاقی اور الہامی ادب کی ایک اعلیٰ ترین شکل ہے کسی بھی ادبی معیار کی، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جیسا ادب کوئی پیدا نہیں کرسکتا۔ لیکن اس کی بنا پر جو ادب پیدا ہوگا، جو اس پر غور کرکے اُن موضوعات کو جن موضوعات کو قرآن نے اختیار کیا ہے، پیش کرے گا اس ادب میں وہ جھلک پائی جائے گی۔ چنانچہ جب اقبال یہ بات کہتے ہیں کہ یہ جو بتانِ وہم و گماں ہیں ان سے ماورا کوئی ہستی ہونی چاہیے وہ جو سب سے عظیم ہے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ۔ اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ پوری کائنات میں جو دمادم آواز آرہی ہے وہ کس چیز کی آرہی ہے؟ وہ تخلیق کی آرہی ہے۔ اور یہ خالق کون ہے؟ رب کریم ہے۔ تو وہ ان سارے مضامین کو جو قرآن کریم نے پیش کیے ہیں، جذب کرنے کے بعد اپنے اندازِ بیان کے ساتھ لوگوں کو منتقل کر رہے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اقبال کے کلام میں جو اثر انگیزی ہے وہ کہیں اور نہیں پائی جاتی۔ اقبال نے اُنہیں بھی متاثر کیا ہے جو اپنے آپ کو ترقی پسند کہتے ہیں۔ بہت سے شاعر وہ مقام حاصل نہیں کرسکتے تھے اگر اقبال کو نہ پڑھتے۔ اقبال کی چھاپ ان پر بھی پائی جاتی ہے۔ وجہ یہی ہے کہ اس میں ایک تخلیقی انداز پایا جاتا ہے، اس میں ایک ندرت پائی جاتی ہے، تخلیق پائی جاتی ہے۔ اور یہ ان کے قرآن کریم سے قریب ہونے کا فیض ہے۔

(جاری ہے)





سندھی تحریر: ذوالفقار گرامانی
ترجمہ: اسامہ تنولی

سندھی تحریر

# ٹارزن نیب اور شہباز شریف کی پالیسیاں

**معروف کالم نگار، تجزیہ نگار اور سندھی نیوز چینلز پر حالاتِ حاضرہ کے پروگرامات میں میزبانی کے فرائض سرانجام دینے والے ذوالفقار گرامانی نے بروز جمعۃ المبارک 5 جون 2020ء کو کثیر الاشاعت سندھی روزنامہ ''پنھنجی اخبار'' کے ادارتی صفحے پر اپنے محولہ بالا عنوان کے تحت لکھے گئے کالم میں جو خامہ فرسائی کی ہے اُس کا ترجمہ قارئین کے لیے پیش خدمت ہے۔**

''یوں تو وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ سے پوچھنے کے لیے صحافیوں کے پاس بے شمار سوالات تھے، لیکن مراد علی شاہ کو اسلام آباد سے واپس سندھ اسمبلی کے اجلاس میں پہنچنا تھا۔ مراد علی شاہ سے سینکڑوں سوالات پوچھنے کا ایک سبب یہ تھا کہ کورونا وائرس کے بعد مراد علی شاہ کی پالیسیوں کی وجہ سے پی پی کے سینئر مصطفیٰ نواز کھوکھر کی حالت یہ تھی کہ ان کے کہنے کے مطابق پی پی کی اتنی زیادہ تعریف سن کر آنکھیں بھر آئی ہیں۔ میڈیا کی آنکھیں بھی مراد علی شاہ کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ واہ واہ کے راستے پر اتنی زیادہ دکھائی دیں کہ اسلام آباد میں مراد علی شاہ حکومت میں اور عمران خان والے حزبِ اختلاف میں دکھائی دینے لگے تھے۔ وفاقی حکومت کی پریس کانفرنسیں مراد علی شاہ کے تذکرے کے بغیر مکمل دکھائی دینا گویا ایک طرح سے امرِ ناممکنات میں شامل تھا۔ یہاں تک کہ وفاقی وزیر اطلاعات شبلی فراز نے تو مراد علی شاہ کی پالیسی کو مودی کی پالیسی قرار دے ڈالا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں مراد علی شاہ گزشتہ کئی دنوں سے میڈیا کی نظروں میں تھے، اور سب منتظر تھے کہ موصوف وڈیو لنک کے اجلاس سے باہر آئیں تو ان سے سب تعریفیں اور تنقیدیں معلوم کی جائیں (جو اُن پر اُن کے کاموں کے حوالے سے ہورہی تھیں، مترجم)۔ مراد علی شاہ کو نیب کے طلب کرنے سے پیشتر چینی کمیشن نے طلب کیا تھا، جس میں پنجاب کے وزیراعلیٰ عثمان بزدار نے بھی شرکت کی تھی، لیکن سندھ کے وزیراعلیٰ طلب کرنے کے باوجود مذکورہ کمیشن کے سامنے پیش نہیں ہوئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اس طلبی پر مراد علی شاہ نے وفاق سے بذریعہ خط کتابت یہ یاد کروایا تھا کہ وہ ایسی کسی نوع کی طلبی کے پابند نہیں ہیں۔ تو پھر یوں ہوا کہ وہی سید مراد علی شاہ ایک گھنٹے کے اندر اندر نیب کے طلب کرنے پر پیش ہونے کا اعلان کرکے کراچی سے اسلام آباد جا پہنچے۔ اس لیے بجا طور پر یہ سوال بنتا تھا کہ جب معاملات بھی منی لانڈرنگ اور ملوں کو سبسڈی دینے کے ہیں تو پھر نیب کے سامنے پیش ہوکر انہوں نے اپنا مؤقف دینا ضروری سمجھا لیکن چینی کمیشن کے سامنے پیش ہونا آخر انہوں نے کیوں گوارا نہیں کیا؟ مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب زرداری ہاؤس اسلام آباد میں سینئر صحافیوں سے دورانِ ملاقات میں نے بلاول بھٹو سے مراد علی شاہ کی موجودگی میں یہ استفسار کیا تھا کہ اسپیکر سندھ اسمبلی آغا سراج درانی اور قومی اسمبلی کے رکن خورشید شاہ جونہی اسلام آباد پہنچے تو انہیں نیب نے گرفتار کرلیا۔ آصف علی زرداری کو زرداری ہاؤس اسلام آباد کے اندر سے نیب ٹیم نے اُس وقت پہنچ کر گرفتار کرلیا تھا جب آصف زرداری بلاول بھٹو، آصفہ بھٹو، قمر الزمان کائرہ سمیت پارٹی کے سینئر قائدین سمیت وہاں موجود تھے۔ پی پی ایم پی اے فریال تالپور کو اُس وقت گرفتار کیا گیا جب وہ دورانِ علالت اسلام آباد کے پمز اسپتال میں داخل تھیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ نیب اس قدر آگے چلا جائے کہ سندھ کے وزیراعلیٰ کو اُس کے گھر کے اندر داخل ہوکر گرفتار کرلے؟ بلاول بھٹو نے جواباً کہا کہ بے شک نیب آکر گرفتار کرے، لیکن میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب بھی یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مراد علی شاہ گرفتار ہوکر جیل میں جائیں یا پھر باہر رہیں، سندھ کے وزیراعلیٰ مراد علی شاہ ہی رہیں گے۔ انہی ایام میں سپریم کورٹ کے اندر مراد علی شاہ کی دہری شہریت کی درخواستیں لے کر پہنچنے کی باتیں بھی سننے میں آئیں، اور اُس وقت بھی یہ بحث ہوا کرتی تھی کہ مراد علی شاہ اس دہری شہریت پر مبنی ایشو کے باعث بالآخر اپنے گھر چلے جائیں گے (یعنی اپنے عہدے پر فائز نہیں رہ پائیں گے، مترجم)۔ اب پنجاب کے وزیراعلیٰ عثمان بزدار کے سبسڈی دینے کے معاملے پر بھی یہ بات زیر بحث ہے کہ اگر موصوف شوگر کمیشن کی رپورٹ پر اپنے گھر چلے جاتے ہیں تو پھر معاملہ سید مراد علی شاہ کے ساتھ بھی یہی کچھ درپیش ہے، اور اس کی نوعیت بھی ویسی ہی ہے جیسی وزیراعلیٰ پنجاب کے معاملے کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اتنی تصویریاں مارکیٹ میں عمران خان کے لیے نہیں ہیں جتنی کہ مراد علی شاہ کے لیے ہیں۔ اگر مراد علی شاہ مائنس نہیں ہوتے تو پھر گورنر رول کے ذریعے سے ان کی حیثیت کو بھی ختم کرنے جیسی باتیں اب پرانی ہوچکی ہیں۔ اس لیے مراد علی شاہ سے ٹائیگر فورس سے لے کر گورنر راج تک صحافیوں کے پاس سینکڑوں سوالات موجود تھے، لیکن مراد علی شاہ کیوں کہ نیب کے پاس دو گھنٹوں سے زیادہ کا وقت گزار چکے تھے، اس لیے اہم سوال یہ تھا کہ اس مرتبہ مراد علی شاہ کو نیب نے کورونا وائرس کی صورتِ حال کے باوجود دو گھنٹوں تک اپنے پاس کیوں بٹھایا ہے، اور آخر وہ کون سے ایسے سوالات تھے جو دو گھنٹوں سے اہلِ نیب سید مراد علی شاہ سے پوچھتے رہے ہیں؟

نیب کے سامنے پیش ہونے کے بعد سید مراد علی شاہ جب باہر تشریف لائے تو اُن کا کہنا یہ تھا کہ نیب نے ان سے کہا ہے کہ آپ کو سوال نامہ ارسال کردیا جائے گا۔ مراد علی شاہ سے صحافیوں نے یہ سوال بھی کیا کہ گزشتہ دنوں شہباز شریف نیب لاہور کے سامنے پیش نہیں ہوئے تھے، جب کہ آپ اسلام آباد پہنچ کر اس کے سامنے پیش ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے لاک ڈاؤن پر بھی آپ کی پالیسی سخت تھی لیکن وفاقی حکومت کے کہنے پر آپ اور لاک ڈاؤن ہر دو نرم پڑ گئے ہیں۔ کیا آپ نیب کے دباؤ پر پیش نہیں ہوئے ہیں؟ اس بار نیب ہیڈ کوارٹر کے سامنے پی پی کے کارکن بھی غیر حاضر تھے۔ اس سے قبل اسی نیب کے سامنے آصف زرداری، بلاول بھٹو، قائم علی شاہ اور مراد علی شاہ کے آنے کے مناظر ہی یکسر مختلف ہوا کرتے تھے۔ اس علاقے کے لیے میڈیا قبل ازیں میدانِ جنگ کے جملے لکھا کرتا تھا، لیکن اب کی مرتبہ منظرنامہ معمول کے مطابق تھا۔ یہ منظر معمول کے مطابق آخر کیوں تھا؟ یہ بجائے خود ایک سوال ہے۔ اس سے پہلے آصف علی زرداری نیب کے سامنے گرفتاری کے بعد جیل سے پمز اسپتال اور پمز سے گھر آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ بلاول بھٹو اور آصفہ بھٹو پمز اسپتال کے اندر بار بار اپنی ملاقاتوں کے دوران آصف زرداری کو قائل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے کہ وہ علاج کے سلسلے میں ضمانت حاصل کرنے کا قانونی حق استعمال کریں، لیکن موصوف اس بات کو ماننے سے انکار کردیا کرتے تھے۔ دوسری جانب نیب یا جیل انتظامیہ آصف علی زرداری کے ذاتی ڈاکٹروں سے علاج کے بجائے ان کے لیے ایسا میڈیکل بورڈ تشکیل دیا کرتی تھی جس میں ان کے ذاتی ڈاکٹر شامل ہی نہیں ہوا کرتے تھے۔ پھر ایسی صورتِ حال کے بعد جب اس بار مراد علی شاہ نے اچانک نیب کے سامنے پیش ہونے کا اعلان کیا تب معاملات اس سبب سے بہت دُور تک دکھائی دے رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی شہباز شریف کے پیش نہ ہونے اور شیخ رشید کی نیب کے ٹارزن ہونے کے حوالے سے کی جانے والی باتوں کے نتائج کو بھی ملاحظہ کرچکی ہے۔ ویسے بھی آصف علی زرداری یہ کہتے رہے ہیں کہ نیب کے پسِ پردہ کون ہے؟ میں اس سے ہی مخاطب ہوں، نیب کے چیئرمین کی کیا مجال کہ وہ اس نوع کے فیصلے صادر کرے! اس لیے پیپلز پارٹی کے لاشعور میں نیب کے پیچھے والی طاقت کی مثال موجود ہے۔ لہٰذا اس مرتبہ پی پی نے قانون کے راستے کو ہی بہتر راستہ متصور کیا ہے۔ جب کہ دوسری جانب شہباز شریف کے کورونا وائرس کی وجہ سے پیش نہ ہونے کا نتیجہ بھی سامنے آچکا ہے۔ اس کی بنیاد پر انہی شہباز شریف کو دوسرے دن لاہور ہائی کورٹ کے سامنے تب پیش ہونا پڑا جب نیب موصوف کے گھر کا گھیراؤ کرچکا تھا۔ شہباز شریف کے گھر



# وٹامن سے اپنی قوتِ مدافعت مضبوط بنایئے

سحرش پرویز

انسانوں سے انسانوں میں منتقل ہونے والے کورونا وائرس کی وجہ سے لوگوں میں زیادہ خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ جب سے یہ وبا پھیلی ہے، لوگ کھانوں کے معاملے میں محتاط نظر آرہے ہیں، کیوں کہ اس بیماری کا مقابلہ مضبوط قوتِ مدافعت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر لوگ وٹامن (حیاتین) کے بارے میں جاننے کی کوشش کررہے ہیں۔ قوتِ مدافعت مضبوط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ بھرپور نیند لیں، پُرسکون رہیں اور تمام ضروری غذائی اجزا پر مشتمل غذا نوشِ جان کریں۔

وٹامن دو الفاظ ''وٹا'' اور ''امیمن'' کے ملاپ سے بنا ہے۔ وٹا انگریزی کے لفظ vital سے ماخوذ ہے، جس کے معنی اہم یا ضروری کے ہیں، جب کہ امیمن (Amine) ایسے کیمیائی مرکبات کو کہتے ہیں جو زندگی کے لیے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کیمیائی مرکبات کی ساخت پیچیدہ ہوتی ہے اور یہ قلیل مقدار میں جسم کو درکار ہوتے ہیں، لیکن زندگی کے لیے اتنے اہم اور ضروری ہوتے ہیں کہ ان کی کمی اور عدم موجودگی سے ہماری صحت متاثر ہونے لگتی ہے۔ عام طور پر وٹامن کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک وہ جو چکنائی میں حل پذیر ہوتے ہیں، جن میں وٹامن بی اور سی کمپلیکس شامل ہیں۔

وٹامن کی بڑی مقدار نباتاتی اور حیواناتی ذرائع سے حاصل ہوتی ہے۔ نباتاتی ذرائع میں ہرے پتے والی ترکاریاں، جڑ والی سبزیاں، دالیں، چنے، لوبیا، گریاں اور ثابت اناج شامل ہیں، جب کہ حیواناتی ذرائع میں کلیجی، گردے، گوشت، اور مچھلی کے علاوہ دودھ، انڈے اور ان سے تیار شدہ مصنوعات شامل ہیں۔ ہمارے جسم کو وٹامن کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں سے کسی بھی وٹامن کی کمی سے بیماریاں لاحق ہونے لگتی ہیں۔ مثال کے طور پر وٹامن اے کی کمی سے جلد کی بیماریاں کیراٹینائزیشن، شب کوری اور ذہنی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔

اب ان وٹامن کا تذکرہ کرتے ہیں جو کورونا میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں، یعنی جو مختلف وبائی امراض کے خلاف انسانی جسم میں بھرپور قوتِ مدافعت یا محافظ بن کر بچاؤ کرسکتے ہیں۔ وٹامن اے نباتاتی غذاؤں میں زرد، نارنجی اور سبز مادے میں بطور کیروٹین پایا جاتا ہے، جو آنتوں میں جا کر وٹامن اے کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ کیروٹین کو پرو وٹامن اے بھی کہتے ہیں۔ جسم میں یہ جگر کے اندر ذخیرہ ہوتا ہے اور اس کی زیادتی سے انسان سردرد، متلی، ڈائریا، ہڈیوں کی تکلیف اور خارش کا شکار ہوسکتا ہے۔

یہ وٹامن جہاں جسمانی نشوونما، بینائی، اور آنکھوں کے لیے نہایت ضروری ہے، وہیں وبائی امراض کے مقابلے میں قوتِ مدافعت پیدا کرکے محافظ کے طور پر کام کرتا ہے۔ اس وٹامن کے ضمن میں یہ بات رکھنی چاہیے کہ دودھ کی مصنوعات، انڈے، مچھلی، سبز پتے والی سبزیوں، پھلی اور نارنجی رنگ والی سبزیوں کا استعمال اس کی کمی نہیں ہونے دیتا۔ لہٰذا اس کی کمی کی تشخیص نہ ہونے تک وٹامن اے سپلیمنٹ کا استعمال نہ کیا جائے، کیوں کہ اس کی زیادتی جسم میں چربی کا ذخیرہ بڑھاتی ہے۔ وٹامن سی ایک سادہ قسم کا نامیاتی ترشہ ہے، جو تمام وٹامن میں سب سے نازک اور حساس ہے اور ہوا لگنے کی صورت میں ضائع ہوجاتا ہے۔ خوراک میں تازہ پھلوں اور سبزیوں میں وسیع پیمانے پر موجود ہوتا ہے، لیکن اس سے حاصل کردہ مقدار کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ انہیں کیسے تیار کیا جائے۔

وٹامن سی جہاں زخموں کو مندمل کرتا، دانت اور ہڈیوں کو بناتا، مسوڑھوں کی بافتوں اور خون کی شریانوں کو مضبوط بناتا ہے، وہیں یہ جسم میں بیماریوں اور جراثیم کے خلاف قوتِ مدافعت بھی پیدا کرتا ہے، جس کی بدولت ہم مختلف خطرناک وائرس سے بچ سکتے ہیں۔ وٹامن ڈی کا سب سے بڑا قدرتی ذریعہ سورج کی شعاعیں ہیں، جن کی موجودگی میں یہ انسانی جسم میں ازخود پیدا ہوجاتا ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں گرمی زوروں پر ہے، لہٰذا ہمارے جسم میں اس کی کمی نہیں ہوسکتی۔

سورج کی شعاعوں کے علاوہ وٹامن ڈی کلیجی، دودھ، انڈے، مکھن اور بالائی وغیرہ میں وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ ہمارے جسم میں وٹامن کا اہم کردار ہوتا ہے، جو وبائی امراض کے خلاف خودبخود حرکت میں آجاتا ہے، لیکن جن افراد میں کمزور مدافعتی نظام پایا جاتا ہے، اُن کو ویکسین یعنی حفاظتی ٹیکے لگوانے پڑتے ہیں تاکہ اسے متحرک کیا جاسکے۔ تاحال کورونا وائرس کی کوئی ویکسین تیار نہیں ہوئی، اس لیے تمام افراد کو چاہیے کہ وہ اپنی غذاؤں میں ایسے وٹامن شامل کریں جن سے قوتِ مدافعت میں اضافہ یا محافظ نظام مضبوط ہو۔

●●

---

کے گھیراؤ کے بعد والا سوال یہ نہیں تھا کہ شہباز شریف گرفتار ہوجائیں گے یا نہیں؟ بلکہ اہم سوال یہ تھا کہ شہباز شریف کے سامنے نیب کے ٹارزن ہونے کے بعد کیا ہوگا؟ کیوں کہ اس سے پیشتر نواز شریف کو ''ووٹ کو عزت دو'' والی بات کے بعد گھر کے اندر ایک ہی پیج پر نہ ہونے والے معاملے سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ نواز شریف اور ان کی صاحبزادی مریم نواز ایک طرف، جب کہ شہباز شریف اور حمزہ شہباز دوسری جانب کھڑے ہوچکے تھے۔ نواز شریف اپنی بیٹی مریم نواز کے ساتھ لندن سے واپس لاہور پہنچے، تب یہ باتیں مشہور ہوئیں کہ شہباز شریف اپنے گھر سے لاہور ائیرپورٹ نہیں پہنچے۔ نواز شریف اور مریم نواز لاہور ائیرپورٹ سے سیدھے جیل پہنچ گئے۔ جب جیل سے نواز شریف لندن پہنچے تب شہباز شریف کے خاندان نے اپنے ٹویٹ کے ذریعے سے شہباز شریف کو ان الفاظ میں مبارک باد دی کہ انہوں نے اپنے بڑے بھائی کو محفوظ بنایا۔ اس کے بعد سے شہباز شریف قابلِ قبول شخص کے طور پر تصور کیے جاتے تھے، جن کی پالیسیوں کی وجہ سے نواز لیگ کے اجلاسوں کی کہانیاں لڑائی کی صورت میں سننے کو ملا کرتی تھیں۔ نواز لیگ کی سینئر قیادت یوں خاموش ہوگئی جس طرح سے مریم نواز کا ٹویٹر خاموش ہے۔ ایسی خاموشی کے ماحول میں شہباز شریف اپنے بڑے بھائی کو لندن چھوڑ کر کورونا لاک ڈاؤن سے ایک روز قبل واپس اپنے ملک آن پہنچے، تب ان سے سینئر قیادت نتائج معلوم کرنے لگی۔ اب نتائج یہ ہیں کہ شہباز شریف ہی کے صاحب زادے جیل میں ہیں، باقی مریم نواز سے خواجہ سعد رفیق برادران تک ضمانتوں پر باہر آچکے ہیں۔ نیب اب شہباز شریف کو بھی تلاش کررہا ہے۔ ایسے ماحول میں جب شیخ رشید یہ کہہ چکے ہیں کہ عید کے بعد نیب ٹارزن بننے والا ہے، اب جب نواز لیگ کا اجلاس ہوگا تب شہباز شریف سے پوچھا جائے گا کہ ذرا خبر تو دیجیے بھلا آپ کی پالیسی سے پارٹی کو کیا ملا؟ اُس وقت معلوم نہیں شہباز شریف کے ہاں اس سوال کا کیا جواب ہوگا!''

●●



نومی اوریسکس اور ایرک کونوے
ترجمہ: ناصر فاروق

مطالعۂ مغرب

# تہذیبِ جدید کا انہدام (2)

# قدرتی ایندھن کا غضب

## آرکٹک کی میتھین سے خارج شدہ کاربن اگلی دہائی تک شاید ہزار گیگاٹن تک پہنچ چکی ہوگی، جو فضا میں موجود کاربن کا بوجھ دگنا کردے گی

سن 2001ء میں، آئی پی سی سی نے پیشگوئی کی کہ ماحولیاتی کاربن ڈائی آکسائیڈ 2050ء تک دگنی ہوچکی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ 2042ء میں ہی ایسا ہوجائے گا۔ درجہ حرارت چار ڈگری بڑھ جائے گا، بڑی بڑی عالمی تبدیلیاں شروع ہوچکی ہوں گی۔ سن 2040ء تک ہیٹ ویوز اور قحط سالی عام بات ہوچکی ہوگی۔ پانی اور خوراک ذخیرہ کرنا، اور ''ایک بچہ'' کی پالیسی عام ہوچکی ہوگی۔ امیر ممالک جہاں سمندری طوفان اور آندھیاں چل رہی ہوں گی، تیزی سے ویران ہونے لگیں گے، اُن علاقوں کی معاشرت پر شدید دباؤ بڑھے گا جو ان طوفانوں سے کم متاثر ہوئے ہوں گے۔

غریب ملکوں میں صورت حال متوقع طور پر زیادہ خراب ہوچکی ہوگی: ایشیا اور افریقا کے دیہاتی علاقوں کی آبادیاں بڑی حد تک نقل مکانی کرچکی ہوں گی، خوراک کی کمی کا شکار ہوچکی ہوں گی، بھوک اور وباؤں کی زد میں ہوں گی۔ پوری دنیا میں سمندروں کی سطح 9 سے 15 سینٹی میٹر بلند ہوچکی ہوگی، تاہم ساحلی آبادیاں جوں کی توں قائم ہوں گی۔

تب، سن 2041ء کے موسم گرما میں شمالی نصف کرۂ زمین پر بدترین ہیٹ ویوز چلیں گی، پوری دنیا میں فصلیں برباد ہوجائیں گی۔ اس کے بعد خوف پھیلے گا، ہر بڑے شہر میں خوراک پر لڑائیاں ہوں گی۔ بھوکے پیاسے انسانوں کی بڑی بڑی ہجرتیں ہوں گی، اس کے ساتھ ساتھ کیڑے مکوڑوں کی بھرمار ہوجائے گی۔ ٹائفس، ہیضہ، ڈینگی بخار، یرقان، اور ایسے ایسے وائرل سامنے آئیں گے جنھیں انسانوں نے کبھی دیکھا یا سنا نہ ہوگا۔ کیڑے مکوڑوں کی بڑھتی چڑھتی آبادیاں کینیڈا، انڈونیشیا، اور برازیل کے پورے پورے جنگلات اجاڑ دیں گی(1)۔

سن 2050ء کی دہائی میں معاشرتی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگے گا، حکومتوں کے تخت الٹ دیے جائیں گے۔ سب سے زیادہ افریقا متاثر ہوگا، ایشیا اور یورپ کے بھی بہت سے حصے متاثر ہوں گے، آبادیوں میں بڑھتی ہوئی مایوسی معاشرہ بندی کی اہلیت کو بری طرح متاثر کرے گی۔ شمالی امریکہ کے عظیم صحرا شمال اور مشرق سے پھیلتے چلے جائیں گے، اور دنیا کی زرخیز ترین زیر کاشت اراضی اجاڑ دیں گے، امریکی حکومت کو خوراک پر لوٹ مار اور لڑائیوں کے باعث مارشل لا لگانا پڑ جائے گا۔ چند سال بعد امریکہ کینیڈا کے ساتھ اشتراک میں یہ اعلان کرے گا کہ دونوں قومیں مل کر ریاست ہائے متحدہ امریکہ تشکیل دے رہے ہیں، تاکہ ایک دوسرے کے وسائل بانٹ سکیں، تاکہ شمال کی طرف نوآبادیوں کی بقا ممکن بنائی جاسکے۔ یورپی یونین بھی اسی نوعیت کے منصوبوں کا اعلان کرچکی ہوگی، کہ رضاکارانہ طور پر انتہائی جنوب میں اسکینڈے نیویا اور انگلینڈ کے مستحق شہری شمال کی طرف از سرِنو آباد ہوجائیں۔ جب کہ اس دوران حکومتیں معاشروں میں نظم وضبط قائم رکھنے کی بھرپور کوششیں کررہی ہوں گی۔ سوئٹزرلینڈ اور بھارت جہاں تیزی سے آبی ذرائع ختم ہورہے ہوں گے، وہ موسمی تبدیلی پر پہلا عالمی ہنگامی اجلاس بلانے کا مطالبہ کریں گے، اور قوموں کو موسمی تبدیلی کے اثرات سے بچنے کے لیے کوششوں پر آمادہ کریں گے۔

سیاسی، کاروباری، اور مذہبی رہنما جنیوا اور چندی گڑھ میں ملاقاتیں کرچکے ہوں گے، ہنگامی اقدامات پر تبادلہ خیال کرچکے ہوں گے۔ بہت سوں نے کہا ہوگا کہ وقت آچکا ہے کہ زیرو کاربن ذرائع توانائی سے رجوع کرنا ہوگا۔ دیگر دلیل دے رہے ہوں گے کہ دنیا توانائی ذرائع کے نئے نظام کا مزید دس سے پچاس سال تک انتظار نہیں کرسکتی۔ جب کہ صورت حال یہ ہوگی کہ فضا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ گھٹتے گھٹتے بھی صدی بیت جائے گی۔ ردعمل میں شرکاء جلدی جلدی موسمی انجینئرنگ اور تحفظ (UNCCEP) کے تحت یونیفائیڈ نیشنز کنونشن پر دستخط کریں گے، اور International Climate Cooling Engineering Project کے بلیو پرنٹس تیار کرنے شروع کردیں گے۔

پہلے قدم کے طور پر سن 2052ء تک ICCEP انٹرنیشنل انجیکشن کلائمٹ انجینئرنگ پراجیکٹ لانچ کرے گا۔ اسے کبھی کبھی سائنس دان کرٹزن کی نسبت سے Crutzen

Project بھی پکارتے ہیں۔ اس سائنس دان نے سن 2006ء میں یہ آئیڈیا سب سے پہلے پیش کیا تھا۔ یہ اُن مجوزہ پراجیکٹس میں سے ایک ہوگا جنہیں اکیسویں صدی کی ابتدا میں لوگوں کی شدید مخالفت کا سامنا رہا ہوگا، مگر اب اکیسویں صدی کے وسط میں عام حمایت مل چکی ہوگی۔ یہ وہ زمانہ ہوگا جب غریب دنیا مدد کے لیے ہر طرف دیکھ رہی ہوگی، جبکہ بحرالکاہل کے جزائر پر آباد قومیں بلند ہوتے سمندروں میں ڈوب رہی ہوں گی۔ پورے ہندوستان میں فصلوں کی تباہی اور قحط سالی پھیل چکی ہوگی۔ دیگر ہولناک واقعات یکے بعد دیگرے سامنے آرہے ہوں گے۔ تیزی سے بڑھتا ہوا درجہ حرارت انسدادی پراجیکٹس معطل کردے گا۔

سن 2060ء تک، آرکٹک کی برف غائب ہوچکی ہوگی۔ برفانی ریچھ سمیت، انواع کی بڑی تعداد ختم ہوچکی ہوگی۔ اب جب کہ دنیا ان بڑے بڑے اور واضح نقصانات پر توجہ کررہی ہوگی، گرمی کی شدت بڑھتی چلی جائے گی۔ سائنس دان جو یہ ساری صورتِ حال دیکھ رہے ہوں گے، اچانک پگھلتی برف اور میتھین کے اخراج کا مشاہدہ کریں گے۔ اصل صورتِ حال واضح نہ ہوگی، تاہم آرکٹک کی میتھین سے خارج شدہ کاربن اگلی دہائی تک شاید ہزار گیگاٹن تک پہنچ چکی ہوگی، جو فضا میں موجود کاربن کا بوجھ دگنا کردے گی۔ کاربن کا یہ عظیم حجم Saganeffect تک لے جائے گا۔ زمین کا درجہ حرارت چھ ڈگری سیلسیس تک بڑھ جائے گا۔

جدید مغربی تمدن کے لیے آخری دھچکا وہ ہوگا کہ جس پر بہت بحث ہوئی، مگر اسے کبھی حقیقی خطرے کے طور پر سنجیدگی سے نہیں لیا گیا: یہ مغربی انٹارکٹیکا کی برفانی تہ کا انہدام ہوگا۔ تکنیکی طور پر مغربی انٹارکٹیکا کے ساتھ جو کچھ ہوگا، وہ محض انہدام نہ ہوگا، بلکہ شمالی نصف کرہ زمین پر سمندروں کی گردش کا معمول بدل جائے گا، یہ سطح پر موجود انتہائی غیر معمولی گرم پانیوں کو جنوبی سمندر کی جانب دھکیل دے گی، جو برف کی تہ کو زیریں حصے سے تہ و بالا کردیں گے۔ یوں برف کی بڑی بڑی تہیں مرکزی خطے سے علیحدہ ہوجائیں گی، اور اس طرح وہ فصیل ہٹ جائے گی، جس نے اب تک جزیرہ نما انٹارکٹک میں برف کی تہ کو قلعہ بند رکھا ہوا تھا، اور پھر سمندر کی سطح تیزی سے بلند ہوجائے گی۔ سن 2073ء سے 2093ء تک تقریباً 90 فیصد برف کی تہ ٹکڑے ہوچکی ہوگی، پگھل چکی ہوگی، اور سمندروں کی سطح پانچ میٹر تک بلند کررہی ہوگی۔ اس دوران گرین لینڈ کی برفیلی تہ، جس کے بارے میں خیال ہے کہ آرکٹک کی تہ کے مقابلے میں کمزور ہے، پارہ پارہ ہورہی ہوگی۔ مشرقی حصہ مغربی حصے سے الگ ہونے لگے گا۔ اس کے بعد برفیلی تہیں ایک ایک کرکے پگھلنے لگیں گی۔ درجہ حرارت کی کمی کے یہ واقعات 'عظیم انہدام' کا حوالہ بن جائیں گے۔ یہ بتدریج معاشرتی، معاشی، اور سیاسی انہدام بن جائیں گے۔ ماہرین یہ پیش گوئی کرچکے ہوں گے کہ سطح سمندر کی 8 میٹر بلندی



> اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی دس نشانیاں بتائی ہیں، ان میں پہلی دھواں (کاربن ڈائی آکسائیڈ)، اور دوسری (دابۃ الارض) حشرات الارض کی بہتات ہے۔ کس قدر خوفناک مطابقت پائی جاتی ہے عالمی حدت کے اثرات اور قربِ قیامت کی نشانیوں میں!

کے بعد دنیا کی دس فیصد آبادی دربدر ہوجائے گی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اُن کے یہ اعداد وشمار بھی کم ثابت ہوں گے: درحقیقت یہ تناسب بیس فیصد تک چلا جائے گا۔ اگرچہ اس دور کے بارے میں اعداد وشمار نامکمل ہی رہیں گے، امکان یہ ہے کہ اس عہد میں ڈیڑھ ارب انسانوں کی عظیم ہجرتیں وقوع پذیر ہوں گی، خواہ یہ براہِ راست اثرات کا نتیجہ ہوں یا بالواسطہ طور پر متاثر شدہ ہوں۔ یہ دربدری 'دوسری سیاہ موت' کا سبب بھی ہوگی، جو یورپ میں بیکٹیریا یرسینیا پیسٹیس کے پھیلاؤ سے ہوگی، یہ ایشیا سے شمالی امریکہ تک پھیل جائے گی۔

عہدِ ازمنہ وسطیٰ میں اس 'سیاہ موت' نے یورپ کے کئی حصوں کی نصف آبادیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا تھا۔ دوسری 'سیاہ موت' بھی ایسے ہی اثرات مرتب کرے گی۔ یہ بات بھی حقیقت سے بعید نہیں کہ دنیا بھر میں ساٹھ سے ستر فیصد غیر انسانی انواع فنا ہوجائیں گی۔

تاہم 2090ء کے آس پاس کچھ ایسا ہوگا جس کی اصل خاصیت سمجھنا فی الحال ممکن نہیں، اس پر الجھاؤ پایا جاتا ہے۔ جاپانی جینیاتی انجینئر اکاری ایشی کاوا ایک کائی زدہ فنگس کی قسم تیار کرچکی ہوں گی، جس میں موجود photosynthetic (یہ پودوں وغیرہ میں موجود وہ خاصیت ہوتی ہے، جو سورج کی روشنی کی مدد سے کاربن ڈائی آکسائیڈ اور پانی کے اجزائے ترکیبی کو ایک ضابطے میں لے آتی ہے) ماحولیاتی کاربن ڈائی آکسائیڈ کو تیزی سے جذب کرلے گی، اور ماحولیاتی بہتری میں معاون ہوجائے گی۔

یہ پنار یا قسم کی فنگی ایشی کاوا کی لیبارٹری سے پہلے ہی جاپان اور دنیا بھر میں پھیلائی جاچکی ہے۔ صرف دو دہائیوں میں اس نے واضح طور پر ویران مناظر کو سبزہ زاروں میں بدل دیا تھا، اور ماحولیاتی کاربن ڈائی آکسائیڈ کے خلاف مؤثر ثابت ہوئی تھی۔ یوں ایشی کاوا کی کاوش نے دنیا کو ماحولیاتی بازیافت کی جانب گامزن کردیا تھا۔

تاہم جاپانی حکومت کے مطابق، ایشی کاوا نے یہ کام تنہا کیا، اور یوں غداری کی مجرم قرار پائی۔ مگر اب بھی بہت سے جاپانی شہری اُسے ہیرو کے طور پر دیکھتے ہیں، اُن کے خیال میں ایشی کاوا نے وہ کام تنہا کردکھایا، جو اُن کی حکومت کرسکتی تھی اور کرنا چاہیے تھا مگر اُس نے نہیں کیا۔

اکثر چینی ماہرین نے یہ دونوں رویّے مسترد کردیے۔ اُن کا خیال تھا کہ جاپانی حکومت نے نہ صرف تخفیفِ کاربن مشن میں ناکامی کا سامنا کیا بلکہ ایشی کاوا کو بھی پہلے ضروری مدد فراہم کی اور پھر اُس کے خطرناک اور غیر یقینی کردار کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ اس معاملے کی حقیقت جو بھی ہو، یہ سچائی اپنی جگہ موجود ہے کہ ایشی کاوا کی تحقیق نے ماحولیات پر چھائی کاربن ڈائی آکسائیڈ کو ڈرامائی انداز میں کم کیا ہے۔

حواشی:

1) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی دس نشانیاں بتائی ہیں، ان میں پہلی دھواں (کاربن ڈائی آکسائیڈ)، اور دوسری (دابۃ الارض) حشرات الارض کی بہتات ہے۔ کس قدر خوفناک مطابقت پائی جاتی ہے عالمی حدت کے اثرات اور قربِ قیامت کی نشانیوں میں!

●●

محمود عالم صدیقی

وفیات

# ناانصافی کے خلاف توانا آواز اور حقوقِ انسانی کے علَم بردار جسٹس ہاسبیٹ سریش چل بسے

اپنی بے باکی، اور ناانصافی کے خلاف پوری شدت سے آواز بلند کرنے والے ممبئی ہائی کورٹ کے حقوقِ انسانی کے علَم بردار سابق جج جسٹس ہاسبیٹ سریش جمعرات کو 91 سال کی عمر میں انتقال کرگئے۔ ملک کے موجودہ وزیراعظم نریندر مودی کو گجرات فسادات کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے انہیں ہٹلر کے لقب سے نوازنے والے جسٹس سریش نے اندھیری میں اپنی رہائش گاہ پر آخری سانس لی۔ جمعہ کو سانتا کروز شمشان بھومی میں ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔

حقوقِ انسانی کے علَم برداروں، قانونی و دیگر شعبوں سے وابستہ اہم شخصیات نے ہاسبیٹ سریش کی موت پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ان کی موت کو حقوقِ انسانی کی جدوجہد کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا ہے۔ وہ کرناٹک کے دکشن کنڑ ضلع میں 20 جولائی 1929ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے منگلور یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی، اور بیلاگوی کی ویسویسوریا ٹیکنالوجیکل یونیورسٹی سے ایم اے کی سند حاصل کی تھی۔ بعد میں ممبئی یونیورسٹی سے ایل ایل ایم کرنے کے بعد 1953ء میں بطور وکیل ہائی کورٹ پریکٹس شروع کی۔ بزرگ سماجی رضا کار وسابق جج جسٹس ہاسبیٹ سریش 29 نومبر 1968ء میں سیشن کورٹ میں ایڈیشنل سیشن جج بننے سے قبل تک ممبئی لا کالج اور کے سی کالج کے لیے سرکاری وکیل کی حیثیت سے شہر کی سٹی سول اور سیشن کورٹ میں خدمات انجام دیتے رہے تھے۔ اکتوبر 1979ء میں انہیں پرنسپل جج بنایا گیا تھا لیکن انہوں نے 1980ء میں عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور ممبئی ہائی کورٹ میں بطور وکیل پریکٹس کرنے لگے تھے۔ انہوں نے بطور جج جہاں قانونی سطح پر بے شمار قابلِ ذکر فیصلے سنائے، وہیں بے شمار فلاحی اور سماجی تنظیموں سے وابستہ ہو کر حقوقِ انسانی کے لیے خدمات انجام دیں۔

جسٹس سریش نے بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہونے والی شنوائی کے علاوہ دیگر کئی قابلِ ذکر مقدمات پر فیصلہ سنایا ہے یا بطور وکیل جرح بھی کی ہے۔ جسٹس وی ایئر کے بقول ''جسٹس سریش ایک ایسی شخصیت تھے جنہوں نے ملک گیر سطح پر انسانی حقوق کی بے شمار تحریکیں چلائیں، ان کے نقشِ قدم پر چل کر ہم بھی انسانیت کی بقا کے لیے کام کرسکتے ہیں''۔

حقوقِ انسانی کی سرگرم کارکن ٹیسٹا سیتلواد کے بقول ''جسٹس سریش سے میری ملاقات ممبئی ہائی کورٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد ہوئی تھی۔ وہ میرے محسن، سرپرست اور ہمدرد تھے۔ وہ ہندوستانی آئین کی سیکولر سماجی اقدار کے حامی تھے۔ انہوں نے سبکدوشی کے بعد اُس وقت ٹریبونل اور عوامی مقدمات کے ذریعے لوگوں کو انصاف دلانے کی کوشش کی جب انصاف کی بنیادیں ہلنے لگی تھیں''۔ ٹیسٹا نے انہیں گجرات فسادات کے مقدمات کے دوران دیے جانے والے حوصلے کے حوالے سے بھی یاد کیا۔

# ممتاز شاعر اور گنگا جمنی تہذیب کی نمائندہ شخصیت گلزار دہلوی کا انتقال

اردو دنیا جمعہ کو بزرگ شاعر اور گنگا جمنی تہذیب کی نمائندہ شخصیت گلزار دہلوی کے داغِ مفارقت دے جانے سے سوگوار ہوگئی۔ وہ ابھی پانچ روز قبل ہی کورونا وائرس کو شکست دے کر گھر لوٹے تھے۔ آنند موہن زتشی جنہیں دنیائے زبان و ادب گلزار دہلوی کے نام سے جانتی تھی، 93 برس کے تھے۔ ان کے بیٹے انوپ زتشی نے خبر رساں ایجنسی پی ٹی آئی کو بتایا کہ ''7 جون کو ان کا کورونا کا ٹیسٹ منفی آنے کے بعد ہم انہیں گھر لے آئے تھے، آج انہوں نے ڈھائی بجے دوپہر کا کھانا کھایا مگر اس کے فوراً بعد اس دارِ فانی سے کوچ کرگئے۔'' انوپ زتشی کے مطابق ''پیرانہ سالی کے ساتھ ساتھ کووڈ کے انفیکشن کے بعد وہ خاصے کمزور ہوگئے تھے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ موت کی ممکنہ وجہ ہارٹ اٹیک ہے۔ اس مہینے کے اوائل میں کورونا سے متاثر ہونے کے بعد وہ گریٹر نوئیڈہ کے شاردا اسپتال میں کئی دن آئی سی یو میں زیرِ علاج رہے اور وائرس سے مکمل صحت یاب ہونے کے بعد اتوار کو گھر لوٹے تھے۔'' وہ مرکزی حکومت کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے اردو کے واحد سائنسی رسالے ''سائنس کی دنیا'' کے مدیر رہ چکے ہیں۔ گلزار دہلوی کشمیری پنڈت تھے۔ شیروانی، جس کی جیب میں اکثر گلاب کا پھول ہوتا تھا، سفید چوڑی دار پاجامہ اور سر پر ٹوپی اُن کی شخصیت کی نمایاں خصوصیت تھی۔

# دوست محمد فیضی بھی کورونا کا شکار ہو کر انتقال کرگئے



ایک شعلہ بیان مقرر، اسلامی جمعیت طلبہ کے ایک فعال کارکن، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے سابق رکن اور سابق صوبائی وزیر دوست محمد فیضی بروز پیر مورخہ !5 جون 2020ء کو کورونا وائرس سے شکست کھا کر داغِ مفارقت دے گئے۔ انہیں انتقال سے دو دن پہلے کلفٹن کے ایک معروف اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ وہ مسلم لیگ (ن) سے سیاسی وابستگی رکھتے تھے۔ بہت عرصے سے وہ ایک اشتہاری کمپنی چلا رہے تھے۔ 16 جون بروز منگل کو ان کی تدفین ڈیفنس کے قبرستان میں کی گئی۔ 17 جون بروز بدھ ان کی رہائش گاہ واقع خیابان جانباز میں ایصالِ ثواب کے لیے قرآن خوانی کی گئی۔











# آہ۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی رفت

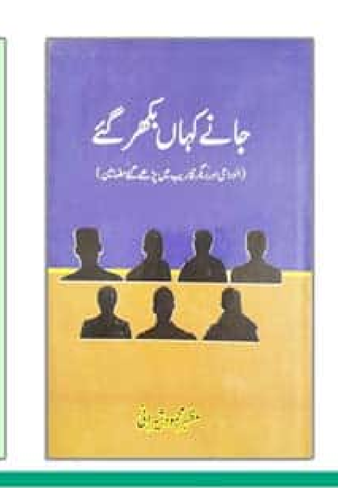
فارسی اور اردو کے نامور محقق اور استاد، کئی علمی کتابوں کے مصنف، مولف و مرتب، کامیاب خاکہ نگار، لغت نگار اور شاعر ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی مورخہ 12 جون 2020ء کو شیخوپورہ میں وفات پاگئے۔ وہ نامور محقق بلکہ بقول رشید حسن خان اردو تحقیق کے معلمِ اوّل حافظ محمود شیرانی کے پوتے اور معروف شاعر اختر شیرانی کے صاحب زادے تھے۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ شیرانی صاحب کی علمی خدمات سے واقفیت حاصل کرنے والے یہی کہتے تھے کہ وہ اپنے دادا کے صحیح جانشین اور ان کی علمی وراثت کے امین تھے، یعنی عربی محاورہ اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیہٖ (بیٹا اپنے باپ کا راز دار ہوتا ہے) تبدیل ہوکر اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِجَدِّہٖ ہوچکا تھا۔ شیرانی صاحب ان باکمال انسانوں میں شامل تھے جو جب تک جیتے ہیں اپنی شفقت، محبت، ہمدردی، دل سوزی، جذبے اور خیر خواہی سے دلوں میں گھر کرلیتے ہیں، اور جب اپنی عمرِ طبیعی پوری کرکے اس جہان سے کوچ کرتے ہیں تو ایسا خلا چھوڑ جاتے ہیں جو کسی صورت پُر ہوتا نظر نہیں آتا۔ راقم سطور بھی ان خوش قسمت انسانوں میں شامل ہے جنھیں گزشتہ 25 برسوں کے دوران شیرانی صاحب سے نہ صرف ملاقاتوں کا شرف حاصل رہا بلکہ ان کی وسعتِ قلبی، جذبہ خیر خواہی اور علمی فیض رسانی سے فیضیاب ہونے کے بار بار مواقع حاصل ہوئے۔

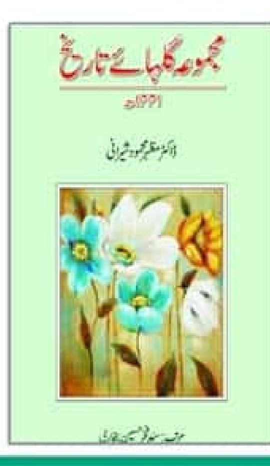
جب سے شیرانی صاحب کے انتقال کی خبر ملی ہے، میر تقی میر کی یہ رباعی بار بار حافظے کی لوح پر نمودار ہورہی ہے:

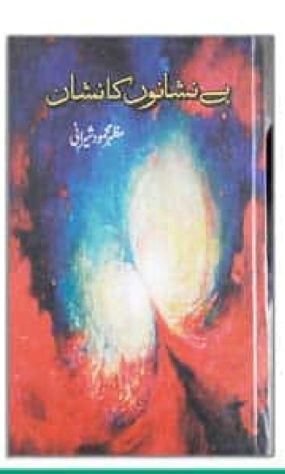
ملیے اس شخص سے جو آدم ہووے
ناز اس کو کمال پر بہت کم ہووے
ہو گرمِ سخن تو گرد آوے یک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

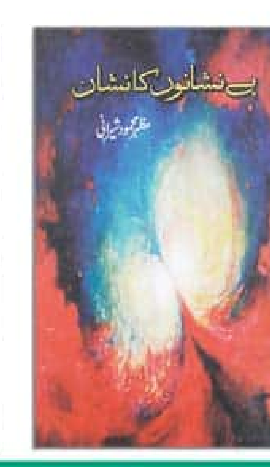
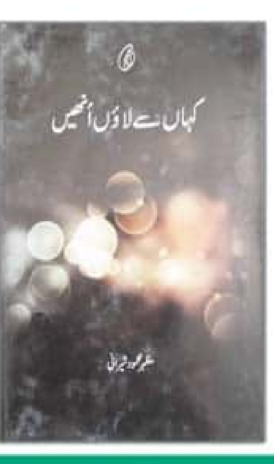
شاید اس رباعی کے یاد آنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے ابتدائی تین مصرعوں میں میر تقی میر نے جن انسانی خوبیوں کا ذکر کیا وہ بہ تمام وکمال شیرانی صاحب کی شخصیت میں موجود تھیں۔ چوتھے مصرعے سے متعلق ہم اس وجہ سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے انھیں کبھی خاموش دیکھا ہی نہیں، بلکہ جب بھی دیکھا، وہ گل افشانیِ گفتار کرتے ہی نظر آئے خواہ شخصی ملاقاتیں ہوں خواہ فون پر گفتگو ہو۔ دورانِ گفتگو وہ کوئی نہ کوئی دلچسپ جملہ زبان سے ادا کرتے جس سے نہ صرف وہ لطف لیتے بلکہ سامعین بھی۔ یہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے ہم ایسے چند جملے نقل کرتے ہیں: ضعیف العمری کی وجہ سے عموماً حافظہ کمزور ہوجاتا ہے لیکن شیرانی صاحب سے گزشتہ کچھ عرصے کے دوران جب بھی گفتگو ہوتی تو وہ فرماتے کہ اب میرا حافظہ مجھے خدا حافظ کہہ رہا ہے۔ اسی طرح جب راقم کی گزشتہ رمضان المبارک سے قبل فون پر گفتگو ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ اب میری سماعت اس مرحلے میں داخل ہوگئی ہے کہ میں غالب کی طرح کہہ سکتا ہوں: بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات۔ شیرانی صاحب ایک مرتبہ جب کراچی تشریف لائے تو حکیم محمود احمد برکاتی مرحوم نے ان کو ناشتے پر مدعو کیا اور راقم سطور کو بھی وہاں آنے کو کہا۔ اس محفل میں ٹونک سے تعلق رکھنے والے کئی بزرگ تشریف لائے تھے۔ وہاں جب شیرانی صاحب تشریف لائے تو آتے ہی وہ رونقِ محفل بن گئے اور ٹونک اور اہلِ ٹونک سے متعلق دلچسپ گفتگو کا آغاز کردیا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے راقم کی جانب غور سے دیکھا اور فرمایا کہ میں آپ کو پہچان نہ سکا۔ اس جملے پر راقم کو ذرا حیرت ہوئی، لیکن جب راقم نے نام بتایا تو بلند آواز میں فرمایا: اخاہ تو یہ آپ ہیں، معاف کیجیے میں آپ کو پہچان نہ سکا لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ جب ہماری آپ سے گزشتہ ملاقات ہوئی تھی تو آپ کی داڑھی ناقابلِ گرفت تھی اور اب قابلِ گرفت ہوگئی ہے، دیکھیے میری داڑھی ابھی تک ناقابلِ گرفت ہے۔ یہ اور اسی طرح کے دلچسپ جملے ان کی گفتگو کا حصہ ہوتے تھے۔ بعض اوقات یوں لگتا کہ مشفق خواجہ مرحوم کی طرح شیرانی صاحب نے بھی زندگی کے آلام اور مصائب و مسائل کا علاج مزاح کے ذریعے کیا، کہ ان سے اثر لینے اور ان پر توجہ دینے کے بجائے خوش مزاجی اور خوش گفتاری سے ان کا علاج کیا جائے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ مزاح میں تہذیب اور شائستگی کا دامن کبھی نہ چھوڑتے تھے کیونکہ وہ مزاح اور پھکڑ پن کے باریک فرق سے بخوبی آگاہ تھے۔

دراصل شیرانی صاحب ان بزرگوں میں شامل تھے جو پہلی ملاقات ہی میں اپنے خلوص، شفقت، محبت اور جذبہ خیر خواہی سے مخاطب کے دل میں گھر کرلیتے ہیں اور جب تک زندہ رہتے ہیں ہر قیمت پر تعلقات نبھاتے ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب تعلقات کی بنیاد غرض کے بجائے خلوص پر مبنی ہو تو وہ وقت گزرنے سے نہ صرف مضبوط ہوتے ہیں بلکہ استوار بھی۔ تقریباً 25 برس قبل بزمِ اقبال لاہور کے دفتر میں راقم کی شیرانی صاحب سے اولین ملاقات ہوئی تھی۔ اُس وقت شیرانی صاحب کی معیت میں ان کے ایک شاگرد بھی موجود تھے، لیکن شاگرد صاحب تو مسلسل گم صم بیٹھے رہے اور شیرانی صاحب مسلسل گل افشانیِ گفتار کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اس اولین ملاقات کے بعد سے ان کے انتقال تک جیسے جیسے وقت گزرتا رہا تعلقات میں استواری آتی گئی۔ وہ جب بھی کراچی تشریف لاتے ان سے طویل ملاقاتیں ہوتیں اور مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ یا اس سے زائد بھی فون پر گفتگو ہوتی۔ اس عرصے میں راقم نے جب بھی کسی قسم کی علمی معاونت کی درخواست کی شیرانی صاحب نے کبھی مایوس نہ کیا، راقم کو خواہ کوئی نادر کتاب درکار ہوتی، رسالے کی ضرورت ہوتی یا کسی مضمون کی، وہ اپنے وسیع تعلقات کو کام میں لاکر یہ فرمائش ضرور پوری کرتے۔ دراصل وہ مخلصانہ تعلقات کو اس سطح تک لے آئے










تھے کہ کبھی ذہن میں یہ خیال بھی نہ آیا کہ وہ علمی معاونت سے پہلوتہی کریں گے یا معذرت کرویں گے یا ٹال دیں گے، بلکہ ہمیشہ یہ یقین ہوتا کہ وہ ضرور بھرپور کوشش کریں گے اور مطلوبہ چیز فراہم کرکے ہی دم لیں گے۔ لطف یہ کہ جب بھی مطلوبہ چیز کے حصول کے بعد راقم بذریعہ فون شکریہ ادا کرتا تو ان کا ردعمل کچھ اس قسم کا ہوتا جیسے انھوں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ تعلقات میں خلوص کی یہ سطح شیرانی صاحب کے سوا کسی اور شخصیت میں نظر نہ آئی۔ اسی طرح جب انہیں کسی کتاب یا مضمون کی ضرورت ہوئی تو عاجز کو لکھتے اور راقم فراہم کرتا۔ اسی طرح عاجز کی جب کوئی نئی کتاب شائع ہوتی تو ان کی خدمت میں ضرور روانہ کرتا۔ اس کے بعد وہ بذریعہ خط کچھ اس طرح شکریہ ادا کرتے کہ راقم شرمندہ ہو جاتا۔ شیرانی صاحب کی محبتوں اور شفقتوں کی حد یہیں تک نہیں تھی بلکہ اس عرصے میں جب بھی ان کی کوئی نئی کتاب شائع ہوتی وہ بذریعہ ڈاک کتاب کا نسخہ اپنے محبت آمیز کلمات تحریر فرما کر ضرور ارسال فرماتے۔ ان سے اس عرصے میں رشتہ مکاتبت بھی قائم رہا، چناں چہ راقم کے ذخیرۂ مکاتیب میں ان کے کم وبیش 95 خطوط محفوظ ہیں۔

شیرانی صاحب گو اردو اور فارسی کے نامور محقق تھے اور انہوں نے اپنے نامور دادا حافظ محمود خان شیرانی کے قلمی آثار کی جمع آوری، ترتیب واشاعت میں زندگی کے 40 سال صرف کیے اور دادا پر ہی Ph.D کا مقالہ بھی لکھا، لیکن ان کو زیادہ شہرت بحیثیت کامیاب خاکہ نگار کے ملی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ہمارے ہاں علمی اور تحقیقی کاموں کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جس کے وہ حق دار ہیں۔ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی کی 10 جلدوں میں جو علمی جواہر انہوں نے محفوظ کر لیے اُن کے بارے میں نامور محقق مشفق خواجہ مرحوم نے ایک خط میں تحریر فرمایا تھا کہ اگر کسی کو یہ معلوم کرنا ہو کہ علم کسے کہتے ہیں تو وہ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی کا مطالعہ کرے۔ مشفق خواجہ مرحوم شیرانی صاحب کی خاکہ نگاری کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چناں چہ اس بارے میں انہوں نے ایک خط میں شیرانی صاحب کو لکھا تھا:

''حقیقت یہ ہے کہ شخصیت نگاری کا جو اسلوب آپ کے ہاں ملتا ہے وہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔ آپ اپنی یادوں کو اس طرح تازہ کرتے ہیں کہ متعلقہ شخصیت کے خدوخال روشن ہوتے جاتے ہیں اور مضمون کے خاتمے پر محسوس ہوتا ہے کہ اس شخصیت کو تو ہم بھی بہت قریب سے جانتے ہیں۔''

شیرانی صاحب کے خاکوں کے اب تک دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ پہلا مجموعہ ''کہاں سے لاؤں انہیں'' ہے جس میں اختر شیرانی، مولانا سید محمد یعقوب حسن، پروفیسر حمید احمد خان، سید وزیرالحسن عابدی، حکیم نیر واسطی، اکرام حسن خان، ڈاکٹر ضیا الدین دیسائی، مشفق خواجہ، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، رشید حسن خان اور احمد ندیم قاسمی کے نہایت دلچسپ خاکے موجود ہیں۔ ان تمام خاکوں میں راقم کو حکیم نیر واسطی کا خاکہ سب سے زیادہ پسند آیا تھا جو سب سے پہلے ماہنامہ قومی زبان کراچی میں شائع ہوا۔ ایک مرتبہ حکیم سیّد محمود احمد برکاتی شہید سے راقم نے جب شیرانی صاحب کے لکھے خاکوں کا ذکر کیا تو انہوں نے بھی اس خاکے کو اُن کا بہترین خاکہ قرار دیا تھا۔ خاکہ نگاری کے موضوع پر شیرانی صاحب کی دوسری کتاب ''بے نشانوں کا نشاں'' ہے جس میں کُل □ 9 خاکے ہیں۔ یہ تمام خاکے ان انسانوں کے ہیں جو غیر معروف لیکن انسانی خوبیوں کے حامل تھے۔ شیرانی صاحب نے اپنے قلم سے یہ خاکے لکھ کر ان غیر معروف انسانوں کو معروف بنا دیا۔

ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی ایک انتھک عالم اور محقق تھے۔ وہ 9 اکتوبر 1935ء کو شیرانی آباد (جودھپور۔ راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے۔ تقسیم کے بعد وہ □ž□ ژکانہ میں کچھ عرصے رہے۔ □ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے تاریخ اور ایم اے فارسی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ □ وہ فارسی زبان وادب کے بے مثل عالم پروفیسر سیّد وزیرالحسن عابدی کے نامور تلامذہ میں شامل تھے۔ □ ملازمت کی ابتدا میں وہ کچھ عرصہ مظفرگڑھ میں رہے □ بعدازاں شیخوپورہ منتقل ہو گئے اور وہیں 12 جون 2020ء کو مختصر علالت کے بعد راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔

شیرانی صاحب نے مقالات حافظ محمود شیرانی کے 10 جلدی منصوبے کے علاوہ ایک اور علمی منصوبے کو بڑی کامیابی سے مکمل کیا اور وہ بھی ریٹائرمنٹ کے بعد۔ یہ منصوبہ ''لغت جامع جی سی یو'' ہے۔ اس عظیم علمی منصوبے پر شیرانی صاحب گزشتہ 25 برسوں سے کام کر رہے تھے۔ یہ فارسی۔ اردو لغت ہے اور اب تک شائع شدہ تین ضخیم جلدوں کو دیکھ کر ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کس قدر مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ شیرانی صاحب نے اسے پانچ ضخیم جلدوں میں مکمل کیا تھا جن میں سے بقیہ دو جلدیں منتظر اشاعت ہیں۔ ان کے دیگر زیر تکمیل علمی منصوبوں میں ''خطوط بنام حافظ محمود شیرانی''، ''خطوط حکیم سید محمود احمد برکاتی'' اور خاکوں کا تیسرا مجموعہ شامل ہیں۔ کچھ عرصہ قبل لاہور سے ان کی کہی تاریخوں پر مشتمل کتاب ''مجموعہ گلہائے تاریخ'' شائع ہوئی جس کا ایک نسخہ انہوں نے راقم کو بھی ارسال کیا تھا۔ مختصراً ان کی کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے:

1- حافظ محمود شیرانی کی علمی وادبی خدمات (2 جلدیں)
2- بے نشانوں کا نشاں (خاکے)
3- کہاں سے لاؤں انہیں (خاکے)
4- مقالاتِ حافظ محمود شیرانی (10 جلدیں)
5- مکاتیب حافظ محمود شیرانی
6- حافظ محمود شیرانی (کتابیات)
7- جادۂ نسیاں (خاکے) از حکیم سیّد محمود احمد برکاتی (مرتبہ)
8- مشاہداتِ فرنگ از حکیم سیّد محمود احمد برکاتی (مرتبہ)
9- منتخب مقالات از حکیم سیّد محمود احمد برکاتی (مرتبہ)
10- مجموعہ گلہائے تاریخ
11- معربات رشیدی (مرتبہ)
12- لغتِ جامع جی سی یو (5 جلدیں)
13- وہ کہاں گئے (خاکے زیر طبع)

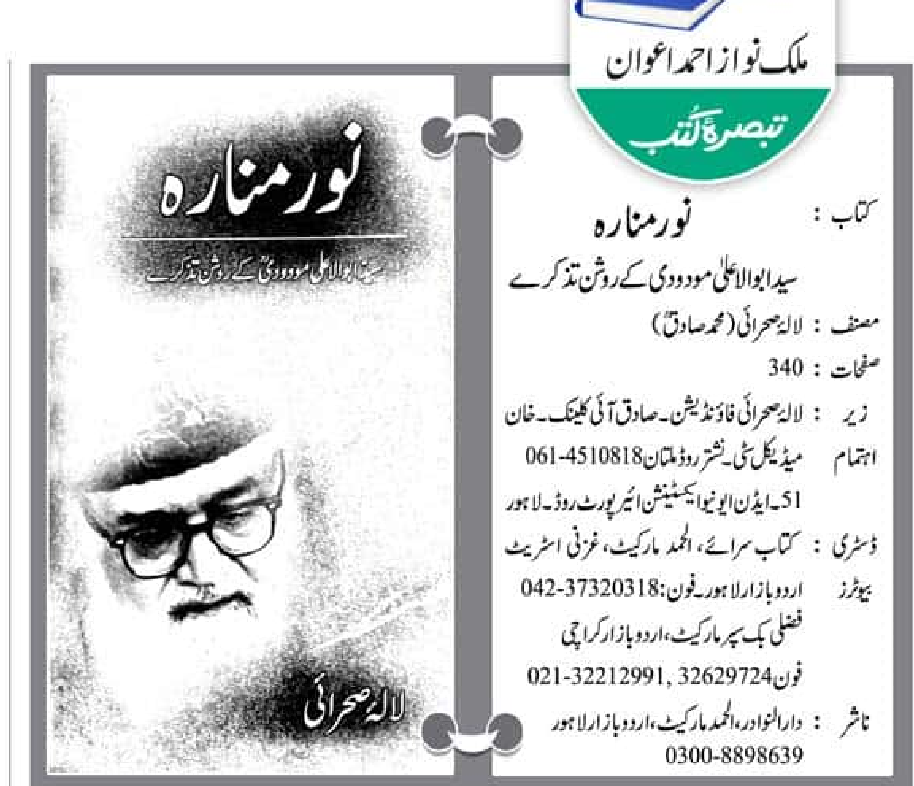
ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی زندگی کی 85 بہاریں دیکھ کر اس فانی دنیا سے عالم بالا کا سفر اختیار کر چکے لیکن شیرانی صاحب کی شیریں یادیں ان سے تعلق رکھنے والوں کے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہیں گی اور انہی خوش نصیب انسانوں میں راقم سطور بھی شامل ہے۔ دعا ہے اللہ مرحوم کی کامل مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آج وہ ہم میں نہیں لیکن بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ عالم بالا سے اپنے مخصوص انداز میں ہم سے یہ کہہ رہے ہوں:

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

●●

ملک نواز احمد اعوان

## تبصرۂ کتب




کتاب : **نور منارہ**

سید ابوالاعلیٰ مودودی کے روشن تذکرے

مصنف : لالۂ صحرائی (محمد صادقؒ)

صفحات : 340

زیر اہتمام : لالۂ صحرائی فاؤنڈیشن۔ صادق آئی کلینک۔ خان میڈیکل سٹی۔ نشتر روڈ ملتان 061-4510818
51۔ ایڈن ایونیو ایکسٹینشن ایئرپورٹ روڈ۔ لاہور

ڈسٹری بیوٹرز : کتاب سرائے، الحمد مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور۔ فون: 042-37320318
فضلی بک سپر مارکیٹ، اردو بازار کراچی
فون 021-32212991, 32629724

ناشر : دارالنوادر، الحمد مارکیٹ، اردو بازار لاہور
0300-8898639

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ پر بے شمار مضامین لکھے گئے ہیں، مگر ان میں جناب لالۂ صحرائی کے مضامین منفرد مقام رکھتے ہیں، کیونکہ اس میں انہوں نے مولانا کے افکار کے اپنی ذات پر اثر کو بخوبی بیان کیا ہے۔ یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے جو ان کے نیک اور صالح صاحبزادوں نے شائع کرایا ہے۔ ڈاکٹر جاوید احمد صادق، ڈاکٹر نوید احمد صادق، سہیل احمد صادق، عقیل احمد صادق صاحبان ہمارے شکریے کے مستحق ہیں جن کی توجہ سے یہ نہایت ہی مفید کتاب منصۂ شہود پہ آئی۔ صاحبزادگان تحریر فرماتے ہیں:

''سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1979ء) بیسویں صدی کے عظیم اسلامی مفکر و مصلح اور اسلامی نشاۃِ ثانیہ کے ایک بڑے داعی تھے۔ انہوں نے اپنی انقلاب انگیز تحریروں سے لاکھوں انسانوں کو دینِ اسلام کا حقیقی شعور بخشا۔ لالۂ صحرائی انہی میں سے ایک تھے۔

سید مودودی کی خیال انگیز تحریروں نے انہیں علم اور شعور عطا کیا تھا۔ لالۂ صحرائی نے سید صاحب کو قریب سے دیکھا تو محسوس کیا کہ ان کے ظاہر و باطن میں، فکر و عمل میں، اور وعظ و کردار میں دوئی نہیں، بُعد نہیں، اور تضاد نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جسے بھی سید مودودی کے قریب جانے کا موقع ملا، وہ ان کی شخصیت کے مقناطیسی دائرے کا اسیر ہوکر رہ گیا۔ لالۂ صحرائی نے سید مودودی سے اپنی چالیس برسوں کی ملاقاتوں اور قربت کی یادوں اور تاثرات پر مبنی تقریباً ایک درجن مضامین لکھے، جو 28 برس پہلے ''نور منارہ'' کے عنوان سے شائع ہوئے تھے۔ یہ کتاب ایک عرصے سے ناپید تھی۔ احباب کا تقاضا تھا کہ شائع کی جائے، چنانچہ مشینی کتابت کے ساتھ اشاعتِ ثانی پیش کی جارہی ہے...... اللہ رب العزت سید مودودی، ان کے جملہ رفقا اور لالۂ صحرائی کی مغفرت فرمائے، آمین۔

ہم محترم ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کے ممنونِ احسان ہیں کہ حسبِ سابق ہمیں نور منارہ کی اشاعت ثانی میں بھی ان کی راہنمائی حاصل رہی اور مفید مشورے ملتے رہے''۔

سید منور حسن المؤقر نے کتاب کی اشاعتِ □ دوم پر اپنا اظہارِ مسرت ان الفاظ میں کیا:

''یہ اطلاع باعثِ مسرت ہے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے بارے میں بزرگِ محترم لالۂ صحرائی کی کتاب ''نور منارہ'' کو آپ دوبارہ شائع کررہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی کو قبول فرمائے۔ بیش از بیش کی توفیق سے آراستہ و پیراستہ فرمائے۔ آمین''۔

جناب محمد صلاح الدین شہید مدیر ہفت روزہ تکبیر جناب لالۂ صحرائی کے جگری دوست تھے، انہوں نے طبع اول کے لیے ''حرفے'' کے عنوان سے جو خیالات تحریر فرمائے وہ ہم یہاں درج کرتے ہیں:

''رواں صدی میں، جو اب اپنے اختتام کو آ پہنچی ہے، جن مسلم مفکرین اور رہنماؤں نے، دنیا کو اسلام سے بحیثیت ایک زندہ و متحرک قوت کے متعارف کرایا اور جن کے افکار و خیالات پورے عالم اسلام کو احیائے دین کا ولولۂ تازہ عطا کرنے کا سبب بنے، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بلاشک و شبہ ان کی صفِ اول کے ممتاز ترین افراد میں سے ہیں۔ آج پوری دنیا میں اسلامی بیداری کی جو لہر برپا ہے، جو تحریکیں جاری ہیں اور جو ادارے اور تنظیمیں قائم ہیں، ان سب پر اس نابغۂ عصر کے اثرات نمایاں ہیں۔ افغانستان ہو یا کشمیر، فلسطین ہو یا الجزائر، اریٹیریا ہو یا مقبوضہ ترکستان، جہاں کہیں بھی کافرانہ اقتدار سے آزادی اور نفاذِ اسلام کی جدوجہد ہورہی ہے، اس کے محرکات میں سید مودودیؒ کا فکری کام لازماً شامل ہے۔

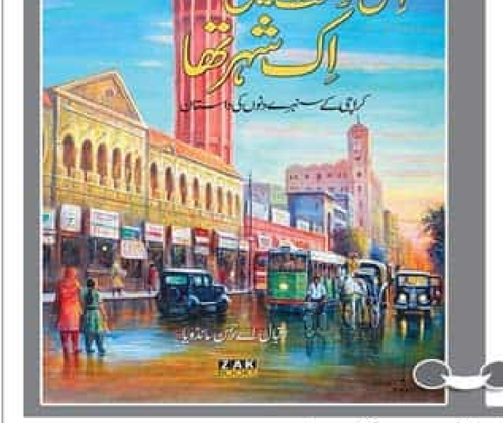
مولانا مودودیؒ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے معاصر معاشرے کو توحید کا حقیقی شعور دیتے ہوئے، خدائے واحد کی پرستش میں حائل دورِ جدید کے سب سے بڑے بت، دین و سیاست کی جدائی کے تصور کو پاش پاش کرکے رکھ دیا۔ انہوں نے نہ صرف نکتۂ توحید کو کھول کر بیان کیا بلکہ عملی طور پر اس کی ادائیگی کے لیے اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو وقف کردیا۔ وہ اپنی منزل کی جانب تنہا چلے اور پھر زمانہ ان کے ساتھ چلنے لگا۔ اپنے تمام ہم عصر علما میں وہ اس لحاظ سے ممتاز ہیں کہ دین کی جزوی خدمت کے بجائے وہ پورا دین ساتھ لے کر چلتے رہے۔ کسی مصلحت یا خوف کے پیشِ نظر انہوں نے دین کے کسی حصے کو ساقط نہیں کیا۔ ان کا کام اس طرح مربوط و یک جان اور اپنے مرکز سے پیوستہ ہے جیسے روشنی اپنے ماسکۂ نور سے مربوط ہوتی ہے۔ ان کا دائرۂ علم زندگی کی تمام وسعتوں کا احاطہ کرتا چلا جاتا ہے۔ لیکن ان کی پرکار کا ایک سرا مضبوطی سے اپنے مرکز پر جما رہتا ہے۔ یہ مرکز ہے عقیدۂ توحید یعنی بندگیِ رب کا اقرار و عہد اور ہر دوسری ہستی کے اقتدار و حاکمیت کی مکمل نفی۔ ان کی ہر تحریر کلمہ طیبہ کی تفسیر ہے۔ وہ ہر شعبہ زندگی سے شرک و بدعات کے لات و منات کا صفایا کرتے اور ان کی جگہ لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا پرچم نصب کرتے چلے جاتے ہیں۔

مولانا مودودیؒ کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ عہدِ جدید کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس پر انہوں نے قلم نہ اٹھایا ہو، اور اس کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر واضح نہ کردیا ہو۔ مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقے کو الحاد، اشتراکیت اور مغربی تہذیب کی دلدل سے نکال کر اسلام کی صراطِ مستقیم پر واپس لانے میں اللہ کے فضل سے انہوں نے کھلی کامیابی حاصل کی۔ اس طبقے کو بین الاقوامی سطح پر جتنا انہوں نے متاثر کیا، اتنا ان کے کسی ہم عصر نے نہیں کیا، اور آج لاکھوں افراد اپنے رب کے حضور یہ گواہی دینے کے لیے موجود ہیں کہ وہ راہِ راست سے بھٹک گئے تھے۔ الحاد، شرک، بدعت، اشتراکیت اور دوسرے گمراہ کن نظریات کی وادیوں میں ٹھوکریں کھا رہے تھے لیکن یہ مولانا مودودیؒ ہیں، جنہوں نے انہیں جہل کے اندھیروں سے نکال کر علم کی روشنی میں پہنچایا۔ آج کمیونزم کی موت، نظام سرمایہ داری سے انسان کی بیزاری اور مستقبل کے عالمی نظام کے طور پر اسلام کے ابھرنے کے جو امکانات روشن نظر آرہے ہیں، حالات کے اس رنگ میں بلاشبہ سید مودودیؒ کا بڑا حصہ ہے۔ یقیناً اپنے عہد کے لیے وہ روشنی کا مینار ثابت ہوئے اور ان کا تحریری کام اور فکری اثرات صدیوں تک زندگی کی تاریک راہوں میں اجالا بکھیرتے رہیں گے۔

میرے عزیز و محترم دوست جناب لالۂ صحرائی نے، صدی کے اس عظیم انسان کے حوالے سے اپنی یادوں کے مجموعے کا نام ''نور منارہ'' بالکل درست رکھا ہے۔ ان تحریروں میں عصرِ حاضر کا یہ محسن جیتا جاگتا، چلتا پھرتا اور اللہ کی زمین پر اللہ کی مرضی کے نفاذ

(باقی صفحہ 41 پر)

**عبدالصمد تاجی**




| | | |
|---|---|---|
| کتاب | : | **اس دشت میں اک شہر تھا** |
| | | کراچی کے سنہری دنوں کی داستان |
| مرتبہ | : | اقبال اے رحمٰن مانڈویا |
| صفحات | : | بڑے سائز میں 800 صفحات |
| قیمت | : | 2000/= روپے |
| ناشر | : | ZAK بکس، 0300-8224645 |

پاکستان کے سب سے بڑے اور غریب پرور شہر کراچی کی تاریخی حیثیت اجاگر کرنے کے بارے میں یوں تو بہت عرصے سے کام ہو رہا ہے اور اس ضمن میں متعدد اہم کتب شائع ہو چکی ہیں جن میں خواجہ دلبر شاہ وارثی کی ''جمال قطب عالم''، گل حسن کلمتی کی ''کراچی جا لافانی کردار''، محمد عثمان دموہی کی ''کراچی تاریخ کے آئینے میں''، بھتری عبدالغفار کاندا کرویا کی ''کراچی کی کہانی تاریخ کی زبانی''، حیات رضوی امروہوی کی ''کراچی کراچی''، شاہ ولی اللہ کی ''یہ شارعِ عام نہیں'' اور ''نارتھ کراچی نصف صدی کا قصہ'' قابلِ ذکر ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ منیر احمد خان نے درست لکھا کہ ''کراچی کے حوالے سے اس قدر تفصیل سے دلچسپ پیرائے میں شاید ہی پہلے کبھی لکھا گیا ہو۔ جو علاقے دیکھے بھالے ہیں اُن کی ایک نئے انداز میں سیر، اور جہاں آج تک جانا نہیں ہوا اُس کی تفصیل قاری کو ایک نئی دنیا میں لے جاتی ہے''۔ معروف مصنف، دانشور عقیل عباس جعفری رقم طراز ہیں: ''اس کتاب میں کراچی کے گلی کوچوں کی تاریخ تو محفوظ کی ہی گئی ہے، اُن شخصیات کا ذکر بھی کیا گیا ہے جن سے ان گلی کوچوں کے محلے اور سڑکیں موسوم ہیں۔ ''دوتلوار'' اور ''تین تلوار'' کی اہمیت کیا ہے، اصل گرومندر کہاں واقع ہے، مشتاق احمد یوسفی نے صیغے اینڈ سنز میں کتابوں کی کس دکان کا ذکر کیا ہے، کراچی کی کون سی سڑکیں موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو سے منسوب تھیں، زیب النساء اسٹریٹ کا نام شہزادی زیب النساء کے نام پر رکھا گیا ہے یا زیب النساء حمید اللہ کے نام پر؟ آرٹس کونسل کراچی کے لیے زمین کا عطیہ کس نے دیا، ہندو جمخانہ اور موہٹہ پیلس کا آرکی ٹیکٹ کون تھا۔ کتاب کیا ہے معلومات کا خزانہ ہے''۔

ناشر زاہد علی خان لکھتے ہیں: ''کتاب ہذا کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہوگا کہ یہ تاریخ ہے یا تحقیقی مقالہ، افسانہ ہے یا حقیقت، آپ بیتی ہے یا جگ بیتی، نوحۂ حال ہے یا تابناک ماضی۔ اگر اس میں شامل کیے گئے اشعار ہی کو یکجا کر لیا جائے تو شاعری کا ایک نہایت خوش نما انتخاب معرضِ وجود میں آسکتا ہے۔ فاضل مصنف نے کراچی کی تاریخ مرتب کرتے ہوئے ایسا شگفتہ اسلوب اختیار کیا ہے کہ آپ کو تاریخ جیسے خشک موضوع میں کہانی کا لطف آئے گا۔ محترمہ گل بانو یوں روشنی ڈالتی ہیں کہ ''عروس البلاد کراچی'' وہ پلیٹ فارم ہے جہاں سے ہم نے انہیں پڑھنا شروع کیا، کراچی پر تحقیقی تحریروں نے ان کے گرد شیدائیوں کا جمگھٹا لگا رکھا تھا۔ یہ کتاب تحقیق و جستجو کا ایسا نچوڑ ہے جس کی تیاری میں بڑی عرق ریزی کی گئی ہے، مختلف علاقوں میں جا کر، مقامی لوگوں کے دلوں میں اتر کر اُن کے جذبات کو دلکش پیرائے میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا انہی کا کمال ہے۔ اقبال صاحب کا اندازِ نگارش سلیس، سادہ اور دلچسپ ہے، کردار افسانوی انداز لیے ہوئے ہیں۔ اہلِ زبان نہ ہوتے ہوئے بھی آپ نے اردو دانوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ کہیں کہیں تو جملوں کو اس خوبصورتی سے تراشا ہے کہ بے اختیار واہ کہنے کو دل چاہا، جیسے تقی بھائی (نہاری والے) کی مہارت کی شان ''کفچہ جو نہاری کی دیگ میں جاتا اور گوہرِ نایاب لے کر لوٹتا''۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں ''دوطرفہ ہجرت کی کرشمہ سازی نے شہر کی مذہبی ثقافت کو نیا رنگ و آہنگ دیا ہے۔ یہاں دیر و حرم کی دنیا آباد تھی۔ دیر اجڑ کر ختم ہوئے اور نئے حرم آباد ہوئے''۔ ایک اور دلچسپ جملہ ملاحظہ کیجیے ''چاندنی رات، ساحل پر ریت کے اوپر تک چلی آرہی تند و تیز موجوں کا شور، ٹکراتی موجوں سے بنتے روشنی کے شرارے اور موجوں کے ساتھ جھل مل کرتی پورے چاند کی روشنی''۔

اس سفر میں نیند ایسی کھو گئی
ہم نہ سوئے رات تھک کر سو گئی

عرضِ مصنف بھی پڑھ لیجیے: ''کوئی دو برس قبل ہم استنبول (ترکی) گئے تو ہمیں استنبول کے کچھ علاقوں میں پرانے کراچی کی جھلک نظر آئی، معلوم ہوا کہ 1970ء کی دہائی تک استنبول اور کراچی تقریباً یکساں انداز کے تھے۔ اس کے بعد استنبول فطری اور مثبت ترقی کرتے ہوئے بہت آگے نکل گیا اور ہم ترقیِ معکوس سے ہمکنار ہوئے اور اپنی شناخت ہی مٹا بیٹھے۔ استنبول میں ورثے کو سنبھالا گیا ہے، لہٰذا وہاں بہت سی جگہوں پر پرانے کراچی کا سا انداز دکھائی دیتا ہے۔ ہم کراچی کی محبت میں سرشار سفر نامہ لکھنے بیٹھے تو اس سفر میں استنبول کم تھا اور کراچی زیادہ، دوستوں نے مشورہ دیا کہ کراچی سے اس قدر الفت ہے تو کراچی پر بھی کتاب ہونی چاہیے''۔

اور اقبال اے رحمٰن مانڈویا نے اس شہر کو ایسی کتاب کا تحفہ دیا کہ جب بھی کراچی کی تاریخ کے حوالے سے گفتگو ہوگی، اس کتاب کے ذکر کے بغیر ادھوری ہوگی۔ کتاب میں جا بجا موضوع کی مناسبت سے معیاری اشعار ان کے اعلیٰ شعری ذوق کا پتا دیتے ہیں۔ کراچی کی ایک معروف بستی کا احوال انہی کی زبانی پڑھیے:

''خداداد کالونی بھی بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد مہاجرین کے سیلاب کے سبب کراچی شہر نے بڑی دشواری کا سامنا کیا، مگر یہاں رہتے بستے انصار کی وسیع القلبی کے سبب معاملات آسان ہوتے گئے۔ کراچی کے معروف گبول خاندان کے ایک بزرگ خداداد صاحب گبول اس شہر کے بہت بڑے جاگیردار تھے۔ خداداد کالونی اور اس سے جڑا علاقہ، اور ساتھ ہی اس شہر میں ان کی اَن گنت زمینیں تھیں، حتیٰ کہ وہ جگہ بھی جہاں آج جناح ٹرمینل قائم ہے۔ مہاجرین کی آمد سے وہ جگہ جہاں آج خداداد کالونی آباد ہے، جھگیوں سے بھر گئی۔ لوگ اس خوف سے کہ یہ جگہ چھوڑنی پڑے گی، عارضی انتظام سے گزر بسر کر رہے تھے۔ خداداد صاحب نے انہیں اس فکر سے نجات دلائی اور اپنی یہ جگہ مہاجرین کے لیے عطیہ کی صورت وقف کر دی۔ جس کی جہاں جھگی تھی وہ جگہ اس کی ہو گئی۔ اب وہ مکان بنانے کے لیے مختار تھا۔ یوں گبول صاحب جیسے ہم وطن کے ایثار سے یہ منفرد بستی آباد ہو گئی۔ کچے مکان جب پکے مکانوں کی صورت میں ڈھلے تو خوبصورت نظارہ پیش کرنے لگے۔ مگر اس ترقی و کامرانی کے پیچھے ایک بلوچ رہنما کا ایسا ایثار ہے جو سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

جن سے زندہ ہو یقین و آگہی کی آبرو
عشق کی راہوں میں کچھ ایسے گماں کرتے چلو
(ساغر صدیقی)

مشہور ادیب شوکت صدیقی جب پاکستان آئے تو سب سے پہلے اس کالونی میں قیام کیا۔ ہجرت کی صورت مصیبت کے مارے جس انداز میں رہتے تھے، ان کے اندر کا انسان ان سے جو کچھ کرواتا تھا اس کی عجیب کہانی ہے۔ ایک جانب تہذیب، شائستگی، وضع داری اور خودداری...... دوسری جانب لٹنے کا غم، ہولناک مسائل، ضرورت اور بھوک...... جو لوگ آتے تھے، کس قدر ستھرے مذاق کے حامل تھے اور ان پر کیا بیتی، یہ سب شوکت صدیقی نے خداداد کالونی میں بیٹھ کر دیکھا اور اس مملکتِ خداداد پاکستان کا عکس خداداد کالونی کو قرار دیا جو ان کے قلم سے ''خدا کی بستی'' (معروف پی ٹی وی ڈراما) کی صورت امر ہو گیا۔ خدا کی بستی دراصل خداداد کالونی کی تصویر ہے جو پاکستان کے ابتدائی ایام میں کھینچی گئی، جسے دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بعد میں شوکت صدیقی صاحب نے کسی رسالے میں ایک افسانہ ''خدادادکلونی'' بھی تحریر کیا۔ کالونی کو ''کلونی'' لکھ کر انہوں نے سب کچھ کہہ دیا۔

800 بڑے صفحات پر محیط یہ داستان آپ جہاں سے بھی پڑھیں گے پڑھتے ہی چلے جائیں گے۔ منفرد اسلوب کی حامل گل بانو صاحبہ کی تدوین نے کتاب کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ سہیلہ سلیم، منیرہ عدنان، سارہ حفیظ الرحمٰن، جاوید احمد اور ان کی اہلیہ نے بھی معاونت کا پورا حق ادا کیا۔ دیدہ زیب سرورق کے ساتھ عمدہ طباعت کی حامل اس کتاب کی قیمت مناسب ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ کتاب شہر کی ہر چھوٹی بڑی لائبریری میں موجود ہو۔ کتاب کراچی کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ بیدار کرتی ہے۔



**بقیہ: دو کبوتر**

نے دیکھا کہ واقعی رسّی کا ایک گولا، میخ اور اس طرح کی کئی چیزیں پڑی ہیں اور کچھ دانہ بھی موجود ہے۔

اس نے رسّی سے پوچھا: ''تو کون ہے؟'' رسّی بولی: ''میں خدا کے بندوں میں سے ایک ہوں اور میں نے اس قدر عبادت و ریاضت کی ہے کہ بے حد لاغر ہوگئی ہوں''۔ اس نے مزید پوچھا: ''یہ کیل اور میخ کس لیے ہے؟'' رسّی بولی: ''کچھ نہیں، میں نے اپنے آپ کو اس سے باندھا ہے کہ مجھے ہوا نہ لے اڑے''۔ ہرزہ بولا: ''اور یہ سبزہ کہاں سے آیا؟'' رسّی بولی: ''میں نے اسے کاشت کیا ہے تاکہ اس پر دانہ آئے اور پرندے اسے کھائیں اور میرے لیے دعا کریں''۔

ہرزہ بولا: ''بہت خوب، میں بھی تیرے لیے دعا کرتا ہوں''۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور دانہ کھانا شروع کردیا۔ ابھی چند دانے بھی اس کے حلق سے نیچے نہ اترے ہوں گے کہ جال سکڑا اور اسے قید کرلیا۔ شکاری بھی سامنے آگیا تاکہ اسے پکڑ لے۔ ہرزہ بولا: ''میں نہ سمجھ پایا اور دوست کی نصیحت پر کان نہ دھرا اور دانے کے لالچ میں قید ہوگیا۔ اب تو خدا کی رضا کی خاطر مجھ پر رحم کر اور مجھے رہا کردے''۔

شکاری بولا: ''سب ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں۔ کون سا پرندہ ہے جو جانے بوجھے جال میں گرفتار ہو؟ ہاں میں شکاری ہوں اور میرا کام پرندے پکڑنا ہے۔ اگر تیری خواہش تھی کہ آزاد رہے تو ضروری تھا کہ شروع ہی سے اپنے پر رحم کرتا، اور جب تُو نے دانہ اور سبزہ دیکھا تھا، اپنے انجام کی فکر بھی کرلیتا۔ اپنے اس ساتھی کو دیکھ کہ شاخ پر بیٹھا ہے۔ دانہ اس نے بھی دیکھا تھا مگر وہ تیری طرح احمق نہیں تھا''۔

جب نامہ بر، ہرزہ کے لوٹنے سے ناامید ہوگیا تو اس نے اڑنے کے لیے پر پھیلائے تاکہ وہ خط متعلقہ لوگوں تک پہنچائے۔

**بقیہ: شفاف احتساب کیسے ممکن ہوگا؟/ سلمان عابد**

چاہیے۔ نیب کو تسلیم کرنا ہوگا کہ ان کا احتساب کا نظام لوگوں میں اپنی ساکھ کھو رہا ہے یا کھو چکا ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو یہ بے لاگ نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ نیب کے اس طرزِ عمل کے باعث حزبِ اختلاف کی جماعتیں یا جو لوگ نیب کے شکنجے میں آتے ہیں، وہ اسے سیاسی انتقام کے بیانیے کے طور پر پیش کرکے اس پورے عمل کو سیاسی بنیادوں پر پرکھ کر اسے متنازع بنا کر پیش کرتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہم حکومت اور حزبِ اختلاف میں بھی ایسا کوئی اتحاد نہیں دیکھتے جو واقعی احتساب کے نظام کو مضبوط بنانے کا خواہش مند نظر آتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں نہ تو موثر پالیسی یا قانون سازی دیکھنے کو ملتی ہے، یا اس میں جو بھی سیاسی، انتظامی اور قانونی رکاوٹیں ہیں ان کا خاتمہ نظر آتا ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ جب تک ہم اداروں کو سیاسی، انتظامی اور قانونی طور پر خودمختار نہیں بناتے، شفاف احتساب کیسے ممکن ہوگا؟ یہ ہماری سیاست، پارلیمنٹ اور نام نہاد جمہوری نظام کی ناکامی ہے کہ ہم احتساب کا موثر نظام قائم نہیں کرسکے، یا یہ ہماری ترجیحات میں کسی بھی طور پر بالادست نہیں۔ اصل مسئلہ پاکستان میں احتساب ایک روایتی اور فرسودہ نظام کی موجودگی میں ممکن نہیں، اس کے لیے بڑے پیمانے پر کڑی اور سخت اصلاحات یا قانون سازی درکار ہے۔ اس معاملے میں موجودہ فریم ورک یا روایتی خیالات سے باہر نکل کر کچھ بڑے فیصلے کرنے ہوں گے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ یہ کام جن لوگوں کو کرنا ہے وہی اس کے لیے تیار نہیں، اور سمجھوتے کا شکار ہیں۔

وزیراعظم عمران خان کو بھی اندازہ ہوگیا ہے کہ وہ جس نظام کا حصہ ہیں اُس میں احتساب کتنا مشکل کام ہے۔ وہ جو دھواں دھار تقریریں عوامی جلسوں میں کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ کام وہ اقتدار میں آکر آسانی سے کرلیں گے، ممکن نظر نہیں آرہا۔ خود ان کی اپنی حکومت میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو انہیں مشورہ دیتے ہیں کہ احتساب کے نظام کو پسِ پشت ڈالیں اور حکومت کریں، وگرنہ ان کے لیے حکومت کرنا مشکل ہوگا۔ بہرحال موجودہ صورتِ حال میں ہمیں احتساب کا عمل ناکام نظر آتا ہے، اور اس میں کوئی بڑی پیش رفت ممکن نہیں، کیونکہ یہ کام محض نیب نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے ریاست، حکومت، عوام اور اہلِ دانش کی مدد درکار ہے جو احتساب کے اداروں کے پیچھے شفافیت کے ساتھ کھڑے ہوں، تبھی یہ کام ممکن ہوسکتا ہے۔

**بقیہ: بھارتی وزیر دفاع کا بدلا ہوا لہجہ/ سید عارف بہار**

بھارت اب آزاد کشمیر کے بارے میں سوچنے کے بجائے مقبوضہ کشمیر میں ''تعمیر و ترقی'' پر ساری توجہ مرکوز رکھے گا۔ خودفریبی کی انتہا یہ کہ جس تعمیر و ترقی سے بھارت مقبوضہ کشمیر کے عوام کو متوجہ اور متاثر نہیں کرسکا، اُس سے آزاد کشمیر کے عوام کے دل پسیجنے کی امید کی جارہی ہے۔ نریندر مودی نے 2015ء میں کشمیر میں اپنی سرگرمیوں کا آغاز 80,000 کروڑ روپے کے اقتصادی پیکیج کے اعلان سے کیا تھا، مگر کسی ایک کشمیری نے اس پیکیج کی جانب نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ آثار و قرائن سے پتا چل رہا ہے کہ چین اور بھارت جنگ کی دہلیز پر رک گئے ہیں، اب نہ صرف ان دو ملکوں میں جنگ کا امکان کم سے کم ہورہا ہے بلکہ پاکستان کے ساتھ کشیدگی بھی جنگ کے پکے راگ کے بجائے دھیمے سُروں کی شکل میں جاری رہ سکتی ہے۔ یہ بات اب بڑی حد تک واضح ہوچکی ہے کہ چین اس مرحلے پر پانچ اگست کے اقدام کی واپسی چاہتا ہے۔ بھارت اس مطالبے کی تکمیل کے لیے باعزت واپسی کے راستے پر اصرار کررہا ہے۔ کشمیر میں آبادی کے تناسب میں تبدیلی کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ''اسٹیٹ سبجیکٹ'' قانون کی بحالی فریقین کے درمیان نقطۂ اتصال بن سکتی ہے۔ ایک اطلاع تو یہ بھی ہے کہ چین صرف پانچ اگست کی پوزیشن کی بحالی ہی نہیں، بلکہ 1953ء کی پوزیشن کی بحالی پر اصرار کررہا ہے جب جموں و کشمیر کی متنازع حیثیت مسلمہ تھی اور بھارت نے بھی مقبوضہ کشمیر کو صدر اور وزیراعظم کے عہدے دے رکھے تھے۔ بھارت نے اس حیثیت کو ختم کرنے کا آغاز ان عہدوں کے خاتمے کے ساتھ کردیا تھا۔ اسی کے بعد کشمیر کا مسئلہ بری طرح اُلجھنا شروع ہوگیا تھا۔ پاکستان آزاد کشمیر میں اسی مقام پر کھڑا ہے، مگر بھارت نے اپنے مقبوضہ علاقے کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ جوں جوں چین اور بھارت کے درمیان ڈپلومیسی کی پرتیں کھلیں گی، بہت سے حقائق بھی کھل کر سامنے آتے جائیں گے۔

**بقیہ: تیل کی قلت، ذمہ دار کون؟/ میاں منیر احمد**

انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان (ایچ ڈی آئی پی) اور پاکستان اسٹیٹ آئل کو شامل کیا گیا، جس کے بعد کمپنیوں کے خلاف کارروائی کی گئی اور نوٹس جاری کیے گئے۔ اوگرا نے 6 آئل مارکیٹنگ کمپنیوں پر 4 کروڑ روپے جرمانہ عائد کیا۔ اوگرا کے قانون کے تحت انہیں 21 دن کا ذخیرہ رکھنا لازمی تھا، اور اگر یہ ذخیرہ نہیں رکھیں گے تو اوگرا جرمانہ لگانے کے ساتھ لائسنس بھی منسوخ کرسکتی ہے۔ اب انہیں ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے جرمانہ کیا گیا۔ ان کا موقف ہے کہ اوگرا کے قانون کے تحت انہوں نے اپنا ذخیرہ جمع کیا تھا، وزارتِ توانائی کے مطابق ملک میں جون کے دوران ایندھن کی طلب 60 ہزار ٹن رہنے کی پیش گوئی کے تحت منصوبہ بندی کی گئی تھی۔

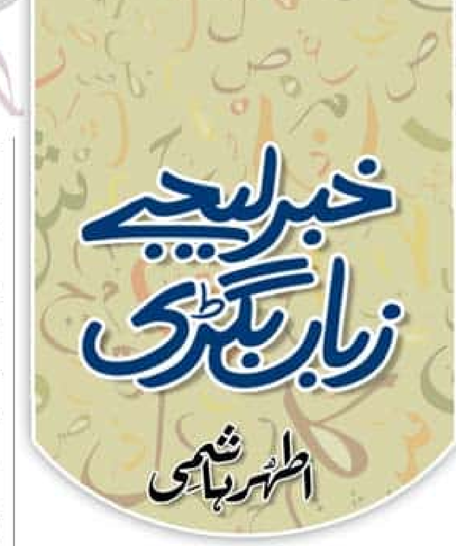
**بقیہ: تبصرہ کتب/ ملک نواز احمد اعوان**

کی کوشش کے ذریعے، اس کی رضا کے حصول کے اس مومنانہ مشن کے لیے جسے اس نے اپنی زندگی کا نصب العین بنایا تھا، سرگرم جہاد نظر آتا ہے۔ ان شاء اللہ یہ کتاب سید مودودیؒ کے اصل پیغام کو اجاگر کرنے کا موثر ذریعہ بنے گی اور مصنف کے لیے توشۂ آخرت ثابت ہوگی۔''

کتاب میں درج مضامین کے عنوانات یہ ہیں:

نورِ منارہ، فورمین، ناوکِ فگن، قافلۂ یقین کا سالارِ اعلیٰ، نجی ذات کا پیکر، اک دانشِ نورانی، راہبر بھی...... رفیق بھی، میرے مولانا، جوئبار نرم رو، اللہ نویس، ملت بیمار کا تیماردار، پہاڑ...... سمندر اور چمن، تیغ و گیاہ، باتیں سید مودودی کی، میرے محسن......، منظوم خراجِ عقیدت (لالۂ صحرائی)

کتاب خوبصورت طبع کی گئی ہے۔ مجلد ہے، عمدہ سرورق سے آراستہ ہے۔




## ”جس کا کام اسی کو ساجھے“

ایک ٹی وی اینکر بتا رہے تھے کہ یہ پرانی کہاوت ہے ”جس کا کام اسی کو ساجھے“۔ یہ کہاوت تو ہے لیکن اس میں ”ساجھے“ نہیں ”ساجے“ ہے۔ ممکن ہے یہ سجنے سے ہو۔ سجنا ہندی کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے موزوں ہونا، آراستہ ہونا، مرتب ہونا۔ بطور فعل متعدی موزوں کرنا، آراستہ کرنا، یعنی جس کا کام ہے وہ ہی اسے ٹھیک طرح کرسکتا ہے۔ اس کہاوت کا دوسرا ٹکڑا ہے ”کوئی اور کرے تو ٹھینگا باجے“۔ اس سے ظاہر ہے کہ باجے کے قافیے میں ساجے آئے گا۔ جہاں تک ساجھے کا تعلق ہے تو اس کی اصل بھی ہندی ہے اور اس کے کئی معانی ہیں۔ معروف معنیٰ اشتراک ہے جیسے ساجھے کی ہنڈیا جو بیچ چوراہے کے پھوٹ جاتی ہے۔ یا ساجھے داری۔ ساجھا لڑنا یعنی کوئی تدبیر ہاتھ آجانا۔ مقولہ ہے ”ساجھے کا کام بُرا“۔ ہمارے خیال میں ساجھے میں نون غنہ پنجاب میں شامل ہوگیا ہے اور سانجھا کہا جانے لگا ہے۔ ویسے ہندی میں ایک لفظ ”سانجھ“ بھی ہے جس کا مطلب ہے سورج ڈوبنے کا وقت یعنی شام۔ سانجھ سویرے کا مطلب ہے صبح، شام یا، شام سے صبح تک۔ ایک گیت ہے ”یاد کروں تجھے سانجھ سویرے“۔

اردو میں انگریزی الفاظ غیر ضروری طور پر ٹھونسے جارہے ہیں۔ مثلاً 15 جون کے ایک اخبار میں پڑھا ”زمین ایکوائر کرنے کے لیے“۔ سامنے کا لفظ تھا زمین حاصل کرنے کے لیے۔ اسی طرح ایک اخبار میں اعلیٰ پولیس افسر نے ”اچھی کارکردگی پر انعام ریکمنڈ کیا“۔ اب اگر ”تجویز کیا“ یا ”منظور کیا“ لکھ دیا جاتا تو کیا انعام یا تمغا یا اعزاز نہ ملتا! انگریزی کے یہ الفاظ ایسے نہیں ہیں جن کا معقول متبادل اردو میں موجود نہ ہو۔ کیا یہ سہل پسندی ہے، لاپروائی ہے یا کیا ہے؟ کوئی مناسب ترجمہ نہ ہو تو بھی بات سمجھ میں آسکتی ہے۔

ایک روش یہ چل پڑی ہے کہ انگریزی کے جو الفاظ اردو کا حصہ بن گئے ہیں ان کی جمع بھی انگریزی قاعدے کے مطابق بنائی جارہی ہے مثلاً ججز، اسکولز، آسمبلیز وغیرہ۔ اگر ان کو اردو قاعدے کے مطابق ججوں، اسکولوں، اسمبلیاں لکھا جائے تو کیا ہرج ہے۔

شعر میں ایسے الفاظ شامل کرنا جو غیر ضروری ہوں اور ان کو نکال دینے سے مفہوم متاثر نہ ہو، اصطلاح میں کاوک یا زاید کہلاتے ہیں۔ حسرت موہانی نے ”نکاتِ سخن“ میں اس کی کئی مثالیں دی ہیں۔ شعر میں تو وزن کی مجبوری ہے لیکن نثر میں ایسی کوئی مجبوری نہیں۔ اس کے باوجود یہاں بھی یہ صورت نظر آتی ہے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اپنی کتاب ”کیفیہ“ میں اس کی مثالیں دی ہیں جن میں حرف جر کا غیر ضروری استعمال ہے۔ مثلاً ”وہیں پر تو وہ بیٹھا تھا، کتاب کو اسی جگہ میں رکھ دو، چار بجے پر چھٹی ہوتی ہے، اس طرح سے کام نہ ہوگا“ وغیرہ وغیرہ۔ ان جملوں میں پر، میں، سے اور کو حشو ہیں یعنی زاید ہیں۔ جیسے پہلا جملہ صحیح یوں ہوگا ”وہیں تو وہ بیٹھا تھا“۔ نثر میں غیر ضروری الفاظ کی بھرتی مضامین میں عموماً نظر آتی ہے جس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

عربی کے جو متعلقات اردو میں استعمال ہوتے ہیں ان میں سے کچھ کا املا یا استعمال غلط ہے۔ مثلاً ”نسلاً بعد نسلاً“ عموماً پڑھنے میں آتا ہے۔ صحیح ”نسلاً بعد نسلٍ ہے“ (نس لن)۔ اساتذہ نے ”قریب المرگ“ اور ”دایم المریض“ پر بھی اعتراض کیا ہے (اساتذہ کا یہی کام رہ گیا ہے)۔ قریب المرگ پر اعتراض یہ ہے کہ ”مرگ“ فارسی کا لفظ ہے اور اس کے ساتھ عربی کا ”ال“ غلط ہے۔ اس اعتراض کو ”قریب مرگ“ لکھ کر دور کیا جاسکتا ہے۔ دایم المریض کی ترکیب بھی عربی قواعد کی رو سے غلط ہے۔ پنڈت برج موہن نے تنازع للبقا پر بھی اعتراض کیا ہے کہ صحیح ”تنازع البقا“ ہے۔ لیکن ڈاکٹر بجنوری نے اسے درست قرار دیا ہے کہ مطلب ادا ہوجاتا ہے۔ ہم بطور طالب علم تنازع للبقا ہی کہتے، لکھتے اور پڑھتے رہے ہیں۔ مشہور انگریزی محاورے کا یہی ترجمہ کیا جاتا ہے۔ ہماری رائے ہے (ویسے ہم کیا اور ہماری رائے کیا) کہ جو الفاظ اردو کا حصہ بن گئے ہیں ان کو ایسے ہی رہنے دیں کہ اس سے زبان کو فروغ ملتا ہے اور یہ کلیہ ہر زبان کا ہے۔ انگریزی میں بھی بہت سے الفاظ دوسری زبانوں سے لے کر شامل کرلیے گئے ہیں اور کہیں ان کا مفہوم بدل دیا ہے تو کہیں املا۔ عربی کے کئی الفاظ انگریزی میں شامل ہیں۔ سامنے کی مثال ”ایڈمرل“ ہے جو عربی کے امیر البحر کا بگاڑ ہے۔ پاگل کو انگریزی میں Lunatic کہتے ہیں۔ یہ لفظ لاطینی زبان سے آیا ہے۔ لاطینی میں Luna کے معنی ہیں چاند۔ اس سے قدیم خیال کی عکاسی ہوتی ہے کہ چاند کا گھٹنا بڑھنا پاگل پن کا سبب ہوسکتا ہے۔ بعض لوگ انسانی چاند کو دیکھ کر پاگل ہوجاتے ہیں۔ عربوں کی طرح اہلِ روم بھی پرندوں سے فال نکالتے تھے۔ لاطینی زبان کا ایک لفظ ہے Auspicious۔ بمعنی مبارک، سعید، سازگار۔ اس کا کھوج لگایا جائے تو یہ لفظ دو اجزاء سے مرکب ہے۔ پہلا جزو AVIS بمعنی پرندہ ہے۔ اسی سے انگریزی میں Aviation بمعنی پرواز بنا۔ یہ لفظ اردو میں بھی دخیل ہوگیا ہے، چنانچہ پاکستان میں سول ایوی ایشن اتھارٹی موجود ہے جس کا معقول ترجمہ شہری ہوا بازی ہے۔ لیکن انگریزی میں کہنے کا الگ ہی مزہ ہے، کہنے والا پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ فرانسیسی میں AVION بمعنی ہوائی جہاز ایوی ایشن ہی سے مشتق ہے۔ اب تو ایک عرصے سے ڈاک کے لفافے نہیں دیکھے لیکن ہوائی ڈاک کے لفافوں پر PAR AVION لکھا دیکھا ہے جس پر زیادہ پڑھے لکھے لوگ BY AIR بھی لکھ دیتے ہیں تاکہ یقین پختہ ہوجائے۔ حاصل یہ نکلا کہ پرندوں کے مشاہدے کے بعد جو گھڑی مبارک سمجھی جائے وہ AUSPICIOUS کہلائے گی۔

اسلام سے پہلے عرب پرندوں کی اڑان سے فال نکالتے تھے۔ کسی مہم پر نکلنے سے پہلے شور مچا کر پرندوں کو اڑاتے اور ان کی اڑان دیکھ کر فیصلہ کرتے کہ مہم پر نکلنا ہے یا گھر لوٹ جانا ہے۔ فال نکالنے کے لیے تطیر کا لفظ استعمال ہوتا تھا جو طیر بمعنی پرندہ سے ماخوذ ہے۔

یہ واضح ہے کہ ہر زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ شامل کیے گئے ہیں۔ اردو میں تو ہر زبان کے الفاظ مل جائیں گے جن میں عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت سے لے کر یورپی زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ مثلاً ”میز“ یہ غالباً پرتگالی زبان کا لفظ ہے۔ الماری بھی باہر سے آئی ہے۔

پروفیسر غازی علم الدین نے ”لفظ اور معنی کی تکرار کا عیب“ کے موضوع پر ایک وقیع مضمون تحریر کیا ہے۔ غازی علم الدین اردو کے عاشقوں میں سے ہیں۔ قصور سے تعلق ہے تاہم آزاد کشمیر کے ایک کالج میں پڑھاتے رہے ہیں اور اب ریٹائر ہوگئے ہیں، لیکن ”کام کے پورے ہیں، دھن کے پکے“۔ اب زیادہ فرصت سے علمی کام پر توجہ دے رہے ہیں۔ ان کے مقالے کے کچھ اقتباسات شامل کرکے اپنے مضمون کو جان دار بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

”اردو کی شکل بگاڑنے کا مذموم عمل، تیز تر ہوچکا ہے۔ اس ضمن میں ٹیلی وژن کے درجنوں اردو چینلز اور سوشل میڈیا کے گھناؤنے کردار کو زیر بحث لانا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے، کیونکہ ان کے سدھار کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ صاحب نظر اور سنجیدہ فکر لوگوں کو تشویش لاحق ہے کہ اخبارات میں برتی جانے والی اردو کا معیار نہایت پست ہوچکا ہے، حتیٰ کہ ادارتی صفحوں پر شائع ہونے والے مضامین بھی املا اور قواعد کی غلطیوں سے پُر ہوتے ہیں۔ اردو کے فروغ میں علمی اور ادبی رسائل و جرائد کا کردار بھرپور اور توانا رہا ہے مگر بدقسمتی سے آج کل اکثر رسائل میں اردو غلط لکھی جاتی ہے جس سے اس کا چہرہ مسخ ہورہا ہے۔ سرکاری اور نیم سرکاری ادارے اردو کے نام پر شہر شہر اور نگر نگر تقاریب منعقد کرتے ہیں۔ اردو کانفرنسیں، ثقافتی اجتماع اور بڑے بڑے کتاب میلے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ان سرگرمیوں میں بظاہر اردو کا نام نمایاں ہے لیکن افسوس! اردو کے اصل مسئلوں کی طرف کسی کی توجہ نہیں ہوتی۔ لسانی بگاڑ عفریت کی صورت اختیار کررہا ہے اور اس کے مداوے کی کوئی بات نہیں کرتا۔ لوگ خدا جانے کہاں کہاں سے کیسی کیسی ترکیبیں، روزمرہ اور محاورے اٹھا کر لارہے ہیں۔ غلط تلفظ، غلط محاورے اور نت نئی اختراعاتِ بد رواج پذیر ہورہی ہیں جن میں ایک لفظ و معنی کی غلط اور بے جا تکرار کا عیب ہے جو ذوقِ سلیم رکھنے والوں پر گراں گزرتا ہے۔ یہ عمل عبارت اور گفتگو کے حسن کو گہنا دیتا ہے۔

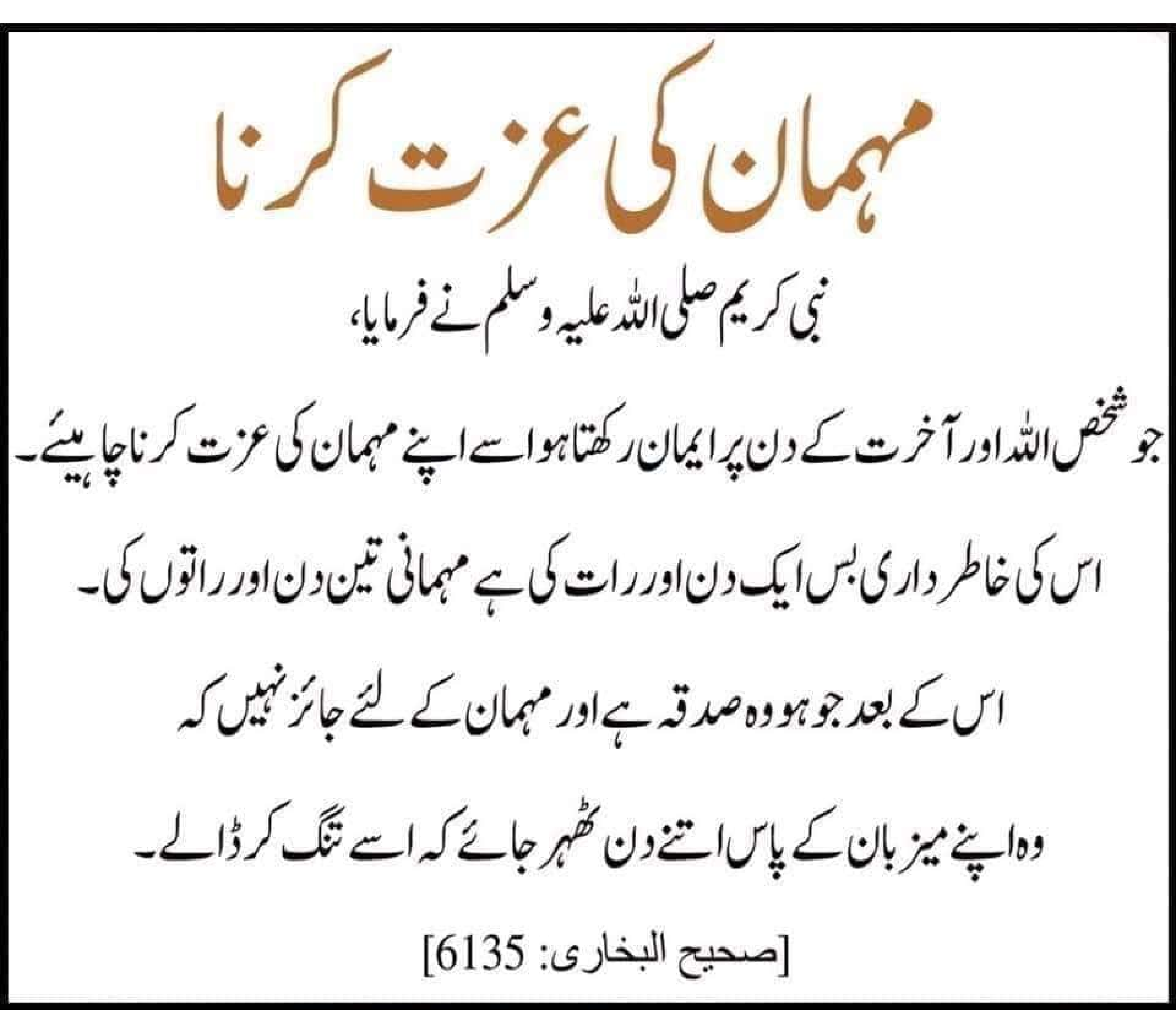
(باقی آئندہ)

ایک بار درود
محمد ﷺ پر
۱۰
رحمتیں
اللہ
کی طرف
سے

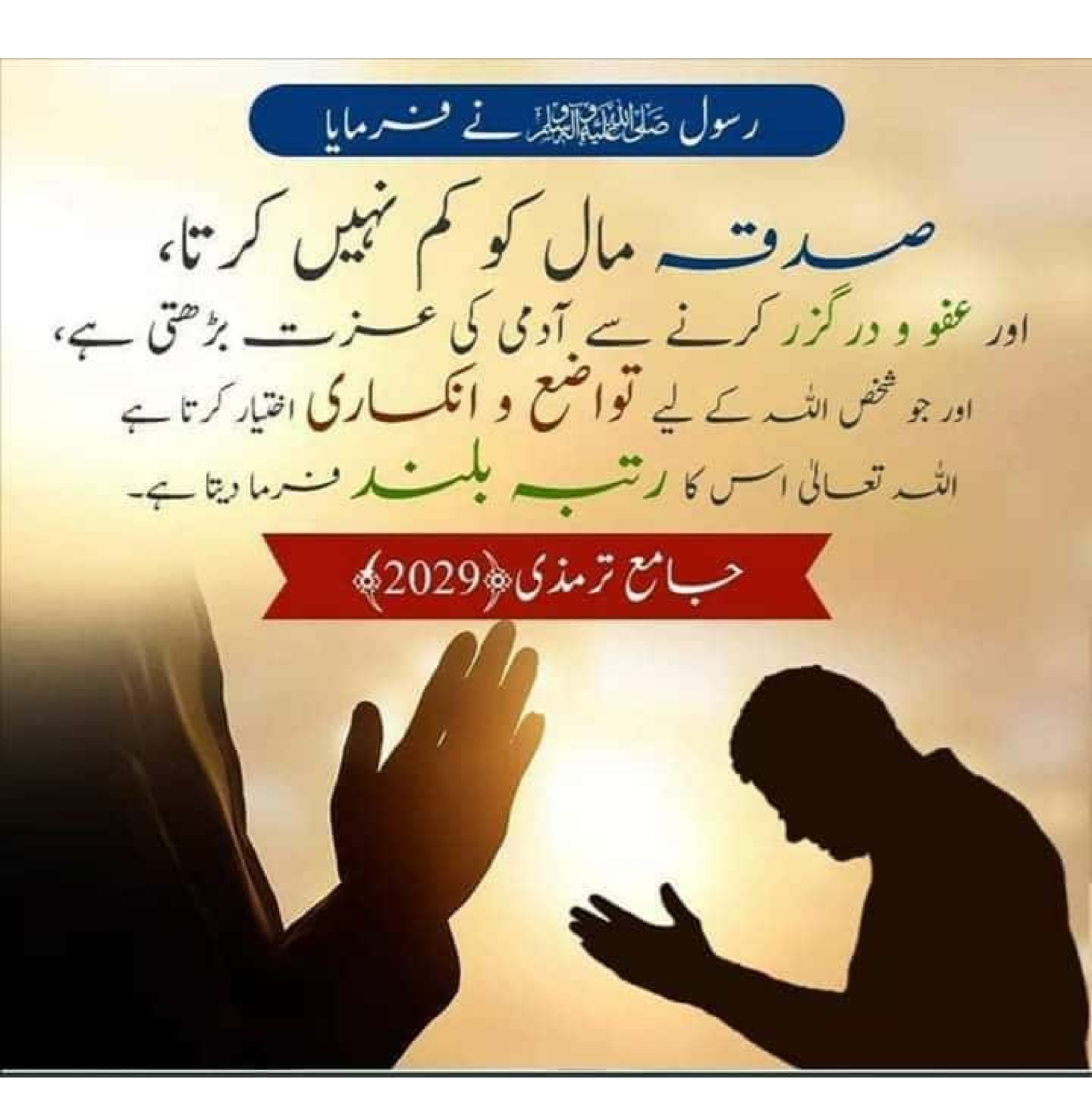
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ
عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی
اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی
اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

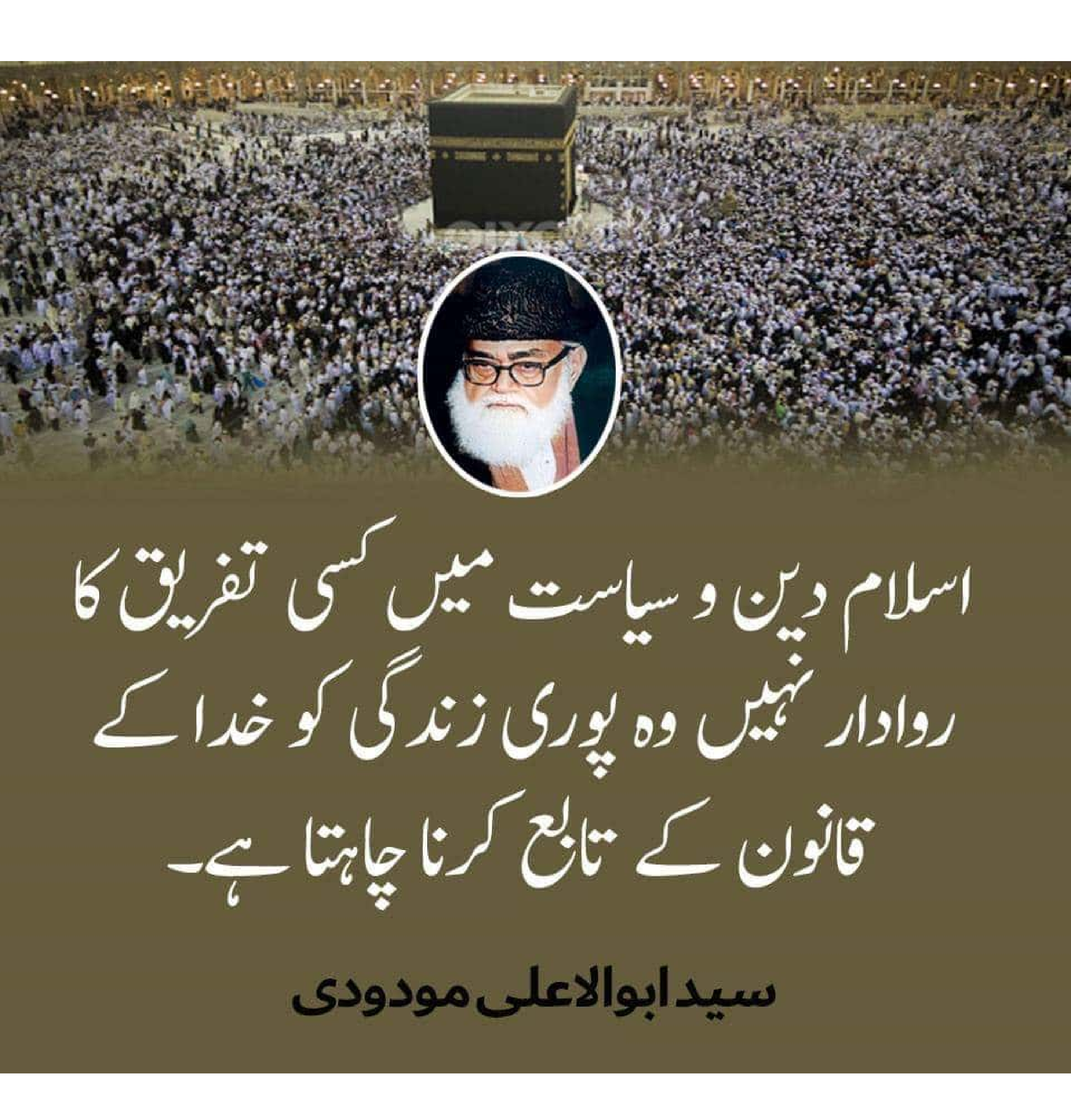
صحیح مسلم: 621

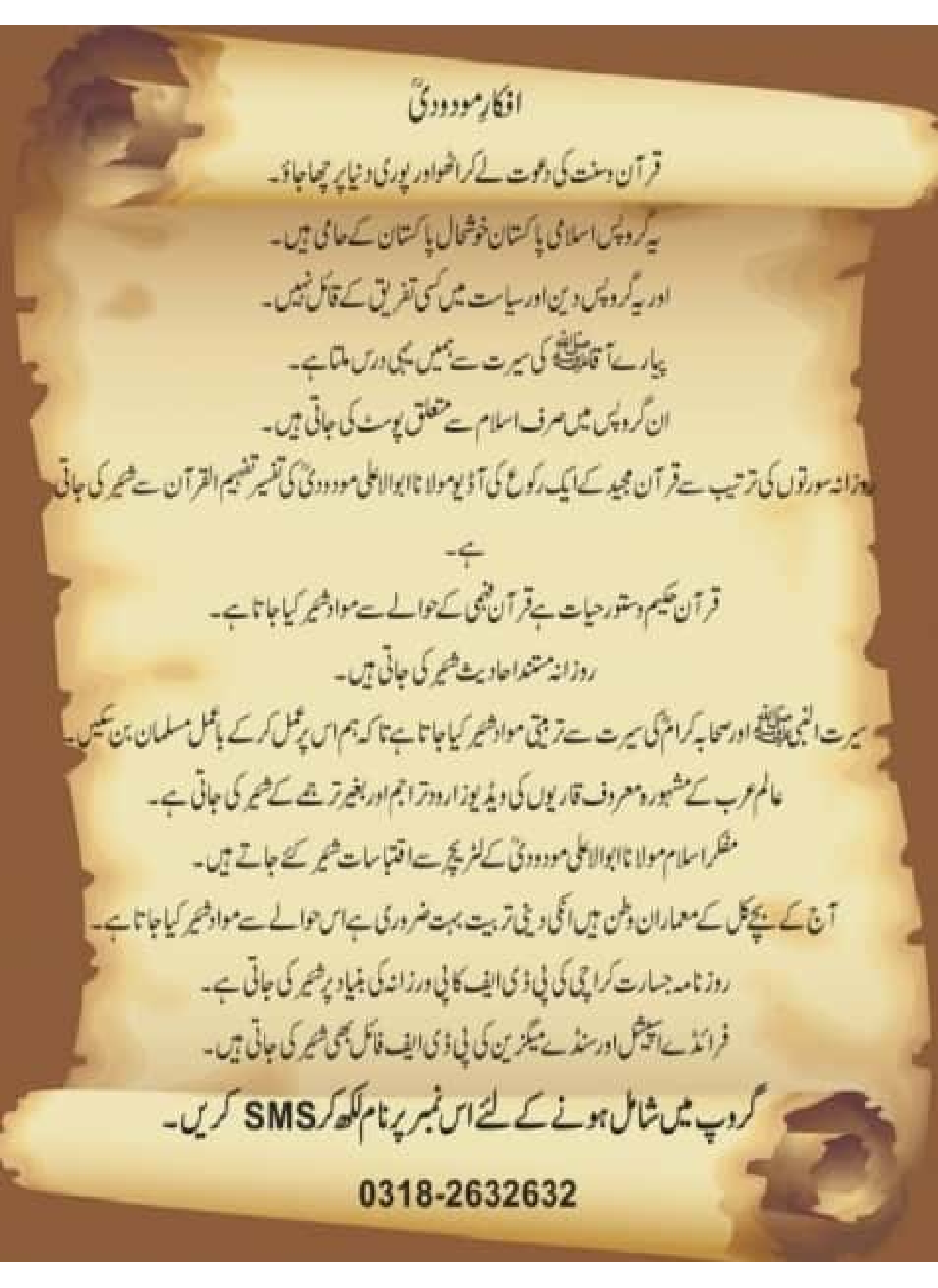
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
جو شخص مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے


مہمان کی عزت کرنا
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،
جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے اپنے مہمان کی عزت کرنا چاہیئے۔
اس کی خاطر داری بس ایک دن اور رات کی ہے مہمانی تین دن اور راتوں کی۔
اس کے بعد جو ہو وہ صدقہ ہے اور مہمان کے لئے جائز نہیں کہ
وہ اپنے میزبان کے پاس اتنے دن ٹھہر جائے کہ اسے تنگ کر ڈالے۔
[صحیح البخاری: 6135]


ہو زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا
نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:
جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی کسی ضرورت
کو پورا کرنے کیلئے اس کے ساتھ چلا یہاں تک کہ
اس کی وہ ضرورت پوری ہوگئی،
تو اللہ تعالیٰ (بروزِ قیامت کہ) جس دن لوگوں کے
قدم ڈگمگا رہے ہوں گے اس کے قدموں کو ڈگمگانے
سے بچائے گا اور ثابت قدمی عطا فرمائے گا۔
(صحیح الترغیب:2623، صحیح الجامع:176)


رسول ﷺ نے فرمایا
صدقہ مال کو کم نہیں کرتا،
اور عفو و درگزر کرنے سے آدمی کی عزت بڑھتی ہے،
اور جو شخص اللہ کے لیے تواضع و انکساری اختیار کرتا ہے
اللہ تعالیٰ اس کا رتبہ بلند فرما دیتا ہے۔
جامع ترمذی 2029


اسلام دین و سیاست میں کسی تفریق کا
روادار نہیں وہ پوری زندگی کو خدا کے
قانون کے تابع کرنا چاہتا ہے۔
سید ابوالاعلی مودودی


افکارِ مودودیؒ
قرآن وسنت کی دعوت لے کر اٹھو اور پوری دنیا پر چھا جاؤ۔
یہ گروپس اسلامی پاکستان خوشحال پاکستان کے حامی ہیں۔
اور یہ گروپس دین اور سیاست میں کسی تفریق کے قائل نہیں۔
پیارے آقا ﷺ کی سیرت سے ہمیں یہی درس ملتا ہے۔
ان گروپس میں صرف اسلام سے متعلق پوسٹ کی جاتی ہیں۔
روزانہ سورتوں کی ترتیب سے قرآن مجید کے ایک رکوع کی آڈیو مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تفسیر تفہیم القرآن سے شئیر کی جاتی ہے۔
قرآن حکیم دستورِ حیات ہے قرآن فہمی کے حوالے سے مواد شئیر کیا جاتا ہے۔
روزانہ مستند احادیث شئیر کی جاتی ہیں۔
سیرت النبی ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی سیرت سے ترجیحی مواد شئیر کیا جاتا ہے تاکہ ہم اس پر عمل کر کے باعمل مسلمان بن سکیں۔
عالم عرب کے مشہور و معروف قاریوں کی ویڈیوز اردو تراجم اور بغیر ترجمے کے شئیر کی جاتی ہے۔
مفکرِ اسلام مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے لٹریچر سے اقتباسات شئیر کیے جاتے ہیں۔
آج کے بچے کل کے معماران وطن ہیں انکی دینی تربیت بہت ضروری ہے اس حوالے سے مواد شئیر کیا جاتا ہے۔
روزنامہ جسارت کراچی کی پی ڈی ایف کاپی روزانہ کی بنیاد پر شئیر کی جاتی ہے۔
فرائڈے اسپیشل اور سنڈے میگزین کی پی ڈی ایف فائل بھی شئیر کی جاتی ہیں۔
گروپ میں شامل ہونے کے لئے اس نمبر پر نام لکھ کر SMS کریں۔
0318-2632632